معارف

اکتوبر ۲۰۲۱ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴/روپے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰/روپے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI
196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN
LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN
Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضروردیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
✆ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپواکر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۸ ماہ صفر المظفر / ربیع الاول ۱۴۴۳ھ مطابق ماہ اکتوبر ۲۰۲۱ء عدد ۴

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
Email:shibli_academy@rediffmail.com

شذرات

رفتار زمانہ کا عجب حال ہے، ملک وملت اور دنیا کے حالات جس سرعت سے دل ودماغ کی دنیا کو زیر وزبر کرتے جاتے ہیں، اس کو دیکھ کر کیا کہا جائے؟ آیا یہ دنیا کچھ خاص نظروں ہی میں دگرگوں ہے یا یہ نظریں سوال بھی کرتی ہیں کہ دیکھنے والے، تیری نظر کیا دیکھ رہی ہے۔ کچھ کو تو یہی لگتا ہے کہ ہر سینہ میں ایک صبح قیامت نمودار ہے، دنیا کی نئی نسل کے سامنے افکار کی لہروں میں طغیانی ہے اور ساحل ہے تو وہ منزل ومراد سے دور ہی ہوتا جاتا ہے۔ گذشتہ چند مہینوں میں جن واقعات نے ساری دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کی ان میں افغانستان میں ایک طویل اور نہایت صبر آزما جدوجہد کا خاتمہ ہے، یوں تو دنیا میں زیادہ تر ملکوں میں بے چینی کی فضا عام ہے، اقصائے امریکہ سے اقصائے چین تک چین نہیں، لیکن افغانستان کی خانہ جنگی یا عوامی اقدار وروایات کی بحالی کی تگ ودو یا غیر ملکی اثرات کی نمایندہ حکومت کے محدود مفادات کی بے محابا سیاست اور اس کے خلاف جدوجہد کو عجب عجب ناموں سے یاد کیا گیا، دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ کھلے استعماری واستحصالی اور سرمایہ ودولت کی انتہا پسندی کی شناخت رکھنے والوں نے افغانستان کی جدوجہد آزادی کو سیاست وصحافت کی ہر دشنام طرازی کا مستحق بنا دیا، لیکن انجام اب اسی دنیا کے سامنے ہے، شکوہ سلطانی تو خدا کا عطیہ ہے، کسی قوم کے فقر سے اس کی حیدری وکراری کا اندازہ لگانے کے لیے بس ایک خاص نگاہ کی ضرورت ہے، زمین کے خطوں کی تاثیر یقیناً جدا جدا رکھی گئی، اگر سنگلاخ اور ہیبت ناک اونچائیوں اور گہرائیوں والا خطہ کسی صاحب دل کو یہ کہنے پر آمادہ کردے کہ تیرے خم وپیچ میں میری بہشت بریں اور آب ترا تابناک اور خاک تری عنبریں تو یہ کہنے والے کا حق ہے۔

افغانستان میں اب جو ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے، لیکن کیا یہ دلچسپ نہیں کہ قریب ایک صدی قبل وہاں کے منظروں پر نظر ڈالی جائے، حال کے آئینہ میں پیش منظر کے امکانات کے ساتھ پس منظر کے رنگ، تصویر کی سچائی کے ضامن بن جاتے ہیں، ہم خوش نصیب ہیں کہ معارف کے آئینہ میں گذشتہ ایک صدی کے جلوؤں کی کمی نہیں، جو احتساب وخود شناسی وخود آگاہی کی راہوں کو

روشن کرتے جاتے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں افغانستان کا تخت شاہی، نادر شاہ کے وجود سے روشن تھا، انہوں نے تعلیمی ترقی کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر محمد اقبال، سر راس مسعود اور پروفیسر ہادی حسن کو دعوت دی، سید صاحب نے اس سفر کو معارف میں ہمیشہ کے لیے افغانستان کے تعلق سے ایک تاریخی وثیقہ بنا دیا، ۱۹۹۱ء میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے اس سفرنامہ کو کتابی شکل میں سفرنامہ افغانستان کے نام سے یہ کہتے ہوئے شائع کر دیا کہ "اس وقت افغانستان میں آزادی وحریت کی ہوائیں چل رہی ہیں جن کو ظلم وتشدد سے روکا نہیں جاسکتا، ایسے موقع پر اس سفرنامہ کی اشاعت اردو خواں طبقہ کی دلچسپی کا باعث ہوگی" آج قریب تیس سال کے بعد آزادی وحریت کی داستان کے ایک اہم باب کے سامنے آنے پر اس سفرنامہ میں جو کچھ دیکھا سنا گیا اور مستقبل کے لیے جو کہا گیا اس کا بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں، سید صاحب کے ہمراہ شاعر خوش نوا نے شہر کابل کو خطہ جنت نظیر کہا، دیار خوش سواد اور پاک بوم کہہ کر اس کی ہوا کو خوشتر زبادشام وروم قرار دیا، اس کے ساکنوں کو سیر چشم اور خوش گہر کہہ کر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ سب کچھ ہے لیکن اس کے باشندے مثل تیغ اپنے جوہر سے بے خبر بھی ہیں۔ سوسال پہلے کے ان تاثرات کو آج کی دنیا کو سنجیدگی سے دیکھنے کی ضرورت ہے، سید صاحب کی نگاہوں نے جہاں خواتین کے پردہ کو اصل اسلامی پردہ خیال کیا وہیں یہ بڑی حقیقت بھی بیان کر دی کہ درہ خیبر میں اور دوسرے آزاد سرحد میں ہر خاندان یا قبیلہ کا الگ الگ قلعہ ہے، اس وقت بھی عالم یہ تھا کہ غریب مسلمانوں کی کمی نہیں تھی ملک کی عام مالی حالت بھی بلند نہیں تھی، آج چین سے ملنے والی افغانی سرحد کی اہمیت کا بڑا ذکر ہے، سید صاحب نے لکھا تھا کہ " کامیابی کی طرف سے خطرات چینی حکومت کی فوجی قوت کے سبب سے نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی باہم فرقہ آرائی اور نفاق انگیزی کے سبب ہیں، سوسال پہلے علامہ اقبال کے اس خیال کو سلیمانی تائید ملی کہ بحری راستوں کی حیثیت جلد فنا ہوجائے گی، آیندہ مشرق وسطیٰ (سنٹرل ایشیا) کا راستہ مشرق ومغرب کو ملائے گا اور تری کی بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا اور چونکہ یہ راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گزرے گا، اس لیے ان ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی وسیاسی انقلاب رونما ہوگا اور اس وقت پہلے کی طرح پھر افغانستان کو دنیا کی شاہراہ بننے کا موقع ملے گا۔ سوسال کی مسلسل جنگوں کا راز کاش مسلم حکمرانوں کی نگاہوں میں فاش ہوجاتا، فاش تو ہوا لیکن غاصبوں اور سامراجیوں کے لیے کہ وقت ایک بار پھر مرکزی ایشیا اور

افغانستان کی مرکزیت یقینی بنانے والا ہے، برطانیہ، روس، امریکا اور مغربی ممالک اور ان کے زیر اثر کچھ ایشیائی ملکوں نے اسی مرکزیت سے محروم کرنے کے لیے جس طرح افغانستان کی سرزمین کو لہو رنگ کیا، سید صاحب اور ان کے رفقا کی نگاہیں کیا دیکھ رہی تھیں جب انہوں نے افغان نوجوانوں کو نصیحت کی کہ سفید بال والوں کی عزت و احترام کا ہر وقت خیال رکھیں، ایسا نہ ہو کہ اختلاف رائے سے قومی وحدت میں رخنہ پیدا ہو جائے، آپسی نفاق اور تفرقہ مسلمانوں کے تمام نقصانات کا سبب بنے ہیں، سید صاحب نے ہند و افغان کے علمی و ادبی تعلقات کے احیاء و استحکام کا ذکر کر کے کیا خوب فرمایا کہ افغانستان نے ہمیشہ اپنے جسمانی زور اور مادی طاقت کے متعلق دنیا سے خراج تحسین وصول کیا ہے لیکن اب ضروری ہے کہ وہ اپنی دماغی طاقت اور ذہنی قوت کا خراج بھی دنیا سے وصول کرے، عالم و ادیب و شاعر اگر حسن و صداقت و خیر کے سفیر ہیں تو ان کو یہ کہنے سے کوئی روک نہیں سکتا کہ موجودہ زمانہ میں افغانستان کی تاریخ نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ اخلاف، نوجوانوں کے لیے سچے راہنما بنیں، زندگی کی عظمت و بزرگی کی بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں کیونکہ آرٹ جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا کر دکھاتا ہے اس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا ہے اور جو حسن قوت سے خالی ہو وہ محض ایک پیغام موت ہے، سب سے بڑھ کر جو بات تب کہی گئی اور جس کی معنویت اب پہلے سے کہیں زیادہ ہے وہ یہ کہ افغانستان کو ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو اس کی قبائلی زندگی سے نکال کر وحدت ملی کی زندگی سے آشنا کر دے۔ کاش یہ نکتہ ان حوصلہ مندوں کے دماغ میں جگہ بنا لے جو دشمن کے لیے تو ایک بنیان مرصوص ہو جاتے ہیں لیکن جرگہ و قبیلہ کی زہرنا کیوں سے خود اپنے شیرازہ کو بکھیرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ عجب معاملہ ہے کہ جس نادر شاہ کی شخصیت میں ہمارے بزرگوں نے شاہ غازی مجدد شرف پایا، ان بزرگوں پر کیا گزری ہوگی جب سفر سے واپسی پر ایسے حکمراں کی شہادت کی خبر ان کو ملی، آج کیا جب بھی افغانستان کا ذکر آتا ہے تو ظاہر بینوں کی خردہ گیریوں سے الگ بس ایک حرف آرزو زبان پر آتا ہے کہ

اے زخود پوشیدہ خود را باز یاب　　　در مسلمانی حرام است ایں حجاب
رمز دین مصطفیٰ دانی کہ چیست　　　فاش دیدن خویش را شاہنشہی است

مقالات

فارسی شاعری: تہذیبی منظر نامہ(۱)

پروفیسر شریف حسین قاسمی☆

بہ نام آن کہ نام ازوی نشان یافت زبان آموخت حرف ونطق جان یافت

تاریخ گواہ ہے کہ فارسی شاعری کی تاریخ قدیم بھی ہے اور مسلسل بھی، اس کی عظمت میں بھی کوئی شبہہ نہیں۔ اس کی وسیع قلم رو میں آج کا ایران، افغانستان، تاجیکستان، ازبکستان، ترکمنستان، آذربائیجان اور براعظم ہندوغیرہ شامل رہے ہیں۔ ان ہی علاقوں میں بسنے والے فارسی زبانوں کے سماجی رویوں (رسم ورواج) کی، جو مجموعی طور پر تہذیب کہلاتے ہیں، بازگشت فارسی شاعری میں سنائی دیتی ہے۔ اس کی سادہ سی وجہ ہے کہ شاعری اپنے گردوپیش میں گزرنے والے واقعات سے غیر متعلق نہیں ہوتی اور بعض اوقات تو ان پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ رسم ورواج قوموں کو بناتے ہیں اور انہیں تاریخ میں تشخص بخشتے ہیں۔ مضمون میں فارسی شاعری کے تناظر میں اسی تہذیب کا مطالعہ اور منظر نامہ پیش کیا گیا ہے، جس کی ہمہ نوع شان وعظمت اور رنگارنگی سے انکار ممکن نہیں۔

مورخین ادب نے فارسی شاعری کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ بدقسمتی سے فنون واشیا کے آغاز وابتدا کے متعلق ایک عجیب قسم کا نظریہ قائم کرلیا گیا ہے کہ ہر شے اور ہنر کا موجد کوئی نہ کوئی خاص ایک شخص ہوا ہے۔ کسی چیز کے اتفاقیہ ظہور میں آنے اور تدریجی ارتقا کے ذریعہ اس کے کمال تک پہنچنے کی تمام تحسین کا سہرا ایک شخص واحد کے سر باندھ دیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر بہرام گور (حکومت ۴۳۸-۴۲۰ء) کو تواتر کے ساتھ فارسی کا پہلا شاعر کہا جاتا رہا ہے اور اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کا یہ شعر بھی مختلف آخذ میں الفاظ کے جزئی اختلاف کے ساتھ نقل ہوا ہے:

☆ شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

منم آں شیر گلہ ، منم آن پیل یلہ نامِ من بہرام گور وکنیتِ من بوحبلہ

جس فارسی شاعری کا آج رواج ہے، اس میں کسی خاص شخص کو شعر کہنے میں اولیت دینا بے سود ہے، لیکن یہ خیال دل لگتا ہے کہ ''جب عرب فاتحین ایران میں آباد ہوگئے اور ان کی بستیاں مختلف مقامات پر قائم ہوگئیں تو یہ نوآبادکار اپنے وطن کے نغمے یعنی شعر کو نہیں بھولے اور جب کچھ مدت کے بعد انھوں نے اپنے نئے وطن کی زبان سیکھ لی تو تفنن طبع کی خاطر اپنے قدیمی وطن کے نغمے اس زبان میں بھی منتقل کرنے لگے۔ اس لیے یہ عرب ہیں جو فارسی میں شاعری کو رواج دیتے ہیں اور اس میں اولین نقوش ثبت کرتے ہیں۔ اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے:

عبیداللہ بن زیاد کا بھائی عباد بن زیاد، یزید بن امیر معاویہؓ کے دور خلافت (۶۰/ ۶۸۰۔ ۶۴/ ۶۸۳) میں سیستان کا حاکم تھا۔ اس سے وابستہ ایک شاعر یزید بن مفرغ تھا۔ حاکم کے عدم التفات کی بنا پر اس نے اپنے سرپرست پر طعن وطنز شروع کردیا جو ظاہر ہے ناپسندیدہ قرار پایا۔ ابن زیاد نے اسے سزا دینے کی خاطر اس کے ساتھ ایک بلی، ایک سور اور ایک کتّا باندھ دیے اور نبیذ شیریں، شِبرم میں ملاکر اس کو پلوادی، جس سے اس کی طبیعت میں سرور اور روانی پیدا ہوگئی۔ اسی حال میں شہر کے کوچہ و بازار میں اس کی تشہیر کی گئی۔ لڑکوں کا غول اس کے پیچھے ہوتا اور شور مچاتا۔ تماشائی فارسی زبان میں پوچھتے تھے کہ این چیست؟ ابن مفرغ فارسی زبان سے واقف ہوچکا تھا۔ وہ فارسی میں جواب دیتا تھا:

آب ست ، نبیذ ست عصا راست زبیب ست

سمیّہ رو سپیذ ست

یہ واقعہ یزید بن معاویہ کے عہد خلافت ۶۸۰ اور ۶۸۳ کے درمیان ظہور پذیر ہوا۔ لہٰذا ابن مفرغ کی اس نظم کو فارسی شاعری کی دستیاب اولین مثالوں میں ایک قدیم ترین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔(۲)

اس کے بعد کے ادوار میں بھی اسی طرح بعض دیگر شعرا سے جستہ جستہ فارسی ابیات منسوب ہیں، یہاں تک کہ طاہری دور (۸۷۳۔۸۲۱)، صفاری دور (۱۴۸۰۔۸۶۷) اور پھر ساسانی دور (۱۰۰۵۔ ۸۱۸) میں فارسی شاعری کی روایت کو استحکام حاصل ہوگیا۔ اسی طرح ان ادوار کے مختلف اصناف سخن میں

شاعری کے نمونے دستیاب ہیں۔اس زمانے کے معروف شعرامیں حنظلہ بادغیسی، فیروزمشرقی،ابوشکور بلخی اوررودکی سمرقندی شامل ہیں۔آخرالذکر کوصاحب دیوان بھی بتایا گیاہے،اس وجہ سے آدم الشعرا کہلایا گیاہے۔

اس طویل دور کے شعرا کا بیشتر دستیاب کلام قصائد پر مشتمل ہے،لہٰذاعام طور پر یہ نتیجہ نکالا گیاہے کہ فارسی شاعری کی ابتدا قصیدے سے ہوئی۔اس کے بعد فارسی شاعری نے ہرلحاظ سے ارتقائی منازل طے کیں اورروز افزوں ترقی کی۔اصناف سخن وموضوعات میں گوناگونی عمل میں آئی۔ زبان بھی تراش خراش کے مراحل سے برابر گزرتی رہی۔صنائع وبدائع کا استعمال بتدریج اپنی انتہا کو پہنچا۔فارسی غیر فارسی علاقوں تک پہنچی اوروسیع وعریض فارسی دنیامیں زبان،بیان اورافکاروخیالات پر جغرافیائی اثرات کا پڑنا بھی قدرتی امرتھا،یہ بھی ہوا۔تعلیم عام ہوئی۔خاص طور پر معارف اسلامی میں دسترس حاصل ہوئی، فارسی شاعری پراس کے اثرات ہمہ گیررہے ہیں۔نجوم وفلسفے کارواج بھی ہوا۔ اب شاعرایک عالم وفاضل شخص بھی تھا،اس کے نتیجے میں شعرکی علمی وادبی سطح کوارتفاع حاصل ہوا۔ فارسی تہذیب کانہایت تاریخی اوردرخشاں پہلومختلف مذاہب کی افہام وتفہیم ہے۔اس بارے میں جو مطالب ہماری نظر سے گزرتے ہیں،ان سے پتا چلتا ہے کہ فارسی زبان والے معتقد تھے کہ زیادہ تر مذاہب اپنے زمانۂ ظہور میں اصلاً واساساً صحیح تھے۔ہاں وقت گزرنے کے ساتھ اوران کے راویوں کے شخصی اغراض اوران کے نقل کرنے والوں کے اشتباہات نے ان مذاہب میں انحرافات پیدا کردیے، جس کی وجہ سے بعد کے اصحاب رائے نے انہیں باطل قراردے دیااوررد کردیا۔اسی نظریے کے پیش نظر مختلف مذاہب کی بنیادی کتابوں کوفارسی کا جامہ پہنایا گیااوربہ آواز بلنداعلان کیا گیا کہ: ہرقوم راست راہی دینی وقبلہ گاہی۔

علم وتہذیب وتمدن کے قدیم گہوارے ہندوستان میں فارسی ادب نے مقامی روایات کا اثر قبول کرنے میں ترقی پذیررویہ اپنایا۔یہاں کی بنیادی مذہبی اورتہذیبی کتابوں کوفارسی میں منتقل کیا گیا۔مقصد یہی تھا کہ مذہبی وتہذیبی بنیادوں پر جوسطحی اختلاف ہےاسے دورکیا اورہم آہنگی کی فضا کو فروغ دیا جائے۔چندتہذیبوں کے ملنے سے جوذہنی اورفکری لین دین ایک فطری عمل ہے،اس میں بڑے توسع سے کام لیا گیا۔فارسی اورمقامی تہذیب کے سنگم نے زبان وفکروخیال کوجووسعت عطا کی،

اس نے فارسی ادب کی تاریخ میں ایک جدید مکتب کا دروازہ کھول دیا جسے بجا طور پر سبک ہندی (ہندستانی اسلوب) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔اس کی اہمیت ومناسبت کوفارسی دنیا نے نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ اس کے امتیازات کوتحسین کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

ہمارے وطن میں اسی تہذیبی توسع اور بہ طیب خاطر لین دین نے ایک نئے کلچر کو بھی جنم دیا جسے ہم فخریہ طور پر مشترکہ تہذیب اورعموماً گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں۔وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جسے دبایا نہیں جاسکتا۔ باہر سے آنے والے بیشتر شعرا ہوں یا مقامی سخن پرداز سب ہی نے ہندوستان، اس کی قدیم تہذیبی روایات اور یہاں کی ظاہری و باطنی خصوصیات کو سراہا ہے۔ ہندوستانی فارسی شاعری کا یہ پہلو نہایت قیمتی ہے اورتاریخی وتہذیبی اہمیت کا حامل بھی۔

فارسی شاعری کے موضوعات اوراس کے قدیم، عظیم اور قابل فخر تہذیبی منظرنامے پرنظر کے لیے مختلف منثور و منظوم مآخذ میں متعلقہ مواد بہ کثرت محفوظ ودستیاب ہے،لیکن پیش نظر مطالعہ کوایک حد میں رکھنے کے لیے فارسی شعرا کے تذکروں ہی پر اکتفا کیا گیا ہے، اس لیے بھی کہ یہ تذکرے اس نوعیت کی اطلاعات کے لیے ایک قیمتی خزانہ ہیں جو شروع ہی سے تاریخ کے مختلف ادوار میں جمع ہوتا رہا ہے اور جو بڑی حد تک مصنّفین کے ذاتی شواہد پر بھی مبنی ہے۔انہوں نے جو دیکھا اور محسوس کیا اسے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔

پیش نظر کتاب کا مطالعہ لازمی طور پر اس نتیجے پر پہنچنے میں راہنما ثابت ہوگا کہ فارسی ادبیات خاص طور پر شاعری پوری فارسی دنیا میں ایک ہی ہیئت، ماہیت و کیفیت اور یکساں انسان ساز اور انسان دوست جذبات واحساسات کی امین ومظہر رہی ہے اور یہ اس کی عام مقبولیت اوردائمی بقا کا ایک راز ہے۔فارسی سماج کی تہذیبی رنگارنگی، وسعت، ہمہ گیری اوراس میں جذب وانجذاب اور لین دین کی خصوصیات نے اسے بین الاقوامیت عطا کی ہے،جس تہذیب کی بنیاد پر اس کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی، وہ مستحکم و پائیدار ثابت ہوئی ہے۔انسانی فطرت کے جن بے شمار ممکنہ اچھے برے پہلوؤں اور بعض اوقات متضاد جذبوں کی رونمائی کی گئی ہے، وہ خود قابل لحاظ اوراس دور مطلق العنانی میں اظہار نظر کی آزادی کا ثبوت بھی ہے۔

شعرا نے جس جذبے اور احساس کو بھی اپنے کلام میں موضوع شعر بنایا ہے، اس میں

جذبات کا دریا پورے زور شور سے رواں دواں ہے۔ شعرانے دوسروں کی مدح وستائش کو نا قابل یقین واعتبار بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اس غلو کا بھی ممدوحین نے بظاہر جس فراخ دلی سے استقبال کیا، اس پر بعض موارد میں یقین نہیں آتا، بلکہ تعجب ہوتا ہے۔ حاکم طبقہ نے اپنی تعریف ومدح میں منظومات کے صلہ میں دادودہش کے دریا بہادیے تھے۔ شعرا کو سونے چاندی میں تولا جاتا تھا، ان کے منہ جواہرات سے بھر دیے جاتے تھے۔ انہیں جاگیریں عطا کی جاتی تھیں۔ ملک الشعرا کا منصب دیا جاتا تھا۔ یہ مدح وستائش معنوی طور پر بھی رائگاں نہیں گئی بلکہ موثر ثابت ہوئی۔ ممدوح پر اس کے مثبت اثرات کے شواہد موجود ہیں، شعرانے اپنے سماج کے ناپسندیدہ عناصر پر جابجا اپنی ناراضگی اور خفگی کو بھی دل میں چھپائے نہیں رکھا اور حتی کہ اس کے بے لاگ اظہار کے جرم میں جان کی بازی بھی لگادی ہے۔ بقول محمد افضل سرخوش:

مقرر شعرا ست کہ قابل مدح را قابل ہجو نیز می دانند۔ (کلمات الشعرا، ص ۶۸، شعرا میں یہ مقرر ہے کہ وہ قابل ستائش کو ہجو کے قابل بھی سمجھتے ہیں)

شعرانے عام طور پر قصاید میں دوسروں کی جائز وناجائز تعریفوں کے پل باندھے ہیں تو اپنی تعریف وستائش کو ہر صنف سخن میں جائز رکھا ہے، اس نوعیت کے کلام کا مطالعہ کیجیے، ایسا معلوم ہوگا کہ شعرا اپنے کلام میں اپنی تعریف وستائش کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کررہے تھے، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی بلیغ ہورہی تھی اور حد تو یہ ہے کہ صوفی شعرا بھی اس رویے کا شکار تھے۔ اس کو تعلّی، انا، خود بینی، اپنی ہستی پر غرور، خودنمائی کے عنوانات دیے گئے اور اس پر اعتراض بھی کیا گیا۔ فارسی شاعری میں اس پہلو کی کثرت اور جابجا اس کے اظہار نے اسے ایک صنف سخن جیسے قصیدے کی حیثیت دے دی ہے اور اس انداز سے بھی اس کا مطالعہ ہونا چاہیے۔ اس نوعیت کا مطالعہ انسانی فطرت ونفسیات کی پیچیدگیوں کی افہام وتفہیم میں کارگر ثابت ہوگا۔

محبوب کی، وہ معنوی ہو یا مجازی، طلسمی شخصیت کی ستائش میں نغمے الاپے گئے ہیں۔ اس سے ٹوٹ کر محبت کی گئی ہے اور بقول علامہ شبلی:

> ”فارسی شاعری میں عشق ومحبت کے جن متنوع پہلوؤں کو نظم کیا گیا اس کی بنیاد پر اس جذبے کی مکمل ترین تاریخ لکھی جاسکتی ہے“۔

ناصر علی سرہندی نے یہی بات اپنے اس شعر میں کہی ہے:

ما مصور زادۂ عشقیم ، شاعر نیستیم یک قلم تصویر معشوق است دیوان ما

شاعر اس میدان میں حتیٰ کہ شاہد بازی (امرد پرستی) سے بھی باز نہیں آیا۔ دونوں عام وصوفی شعرا اس عمل شنیع میں مبتلا نظر آتے ہیں اور اس کے نتیجے میں انجام کار مارے بھی جاتے ہیں۔ شاعر اول انسان ہے۔ تضادات کا مرکب اور مجموعہ، نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار۔ وہ فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی۔ نیکی کرنے پر آئے تو فرشتوں کی برابری کرنے لگے اور برائی کرنے کی ٹھان لے تو شیطان کو پیچھے چھوڑ دے:

آدمی زادہ طرفہ معجونی است کز فرشتہ سرشتہ و ز شیطان

گر رود سوی این شود کم ازین ور رود سوی آن شود بہ ازان

انسان کے ان دونوں رویوں کی فارسی شاعری میں عکاسی ہوئی ہے۔ بغض وحسد کا بھی خوب خوب اظہار کیا گیا اور اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہا گیا اور مذاق اڑایا گیا ہے۔ ایک دوسرے کے فن شعر کو ہدف ملامت قرار دیا گیا ہے، اسی ضمن میں اچھے اور برے شعر کے بارے میں قابل قدر عقاید و نظریات فراہم ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اپنے وطن سے والہانہ محبت کی ہے، حب الوطنی کو آدھا ایمان قرار دیا گیا ہے۔ یہاں بھی اگر کچھ جائز یا ناجائز ناگوار خاطر ہوا ہے تو اس جذبے اور ردعمل کو بالائے طاق نہیں رکھ دیا گیا ہے۔ ایک زندہ، ہنس مکھ اور حساس گروہ کی طرح لطائف وظرائف کے دریا بہا دیے ہیں اور اس طرح نہ صرف خود بلکہ دوسروں کو بھی مسرت وابتہاج، ہنسی اور قہقہوں سے بے حال کر دیا ہے۔ اس میں کبھی شائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ بھی گیا ہے۔ ریا اور ظاہری زہد کی برابر مخالفت کی جاتی رہی۔ اس ضمن میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ شاعر اور زاہد میں للّٰہی بغض وعناد مسلسل جاری رہا ہے اور آج بھی ہے۔ شعرا زاہدوں کو یہی طعنہ دیتے رہے کہ:

زاہد از چشم بتان روغن بادام طلب سر خشک تو سفالی است کہ من می دانم

دراصل شیخ، زاہد، محتسب علامتیں بن گئے ہیں تنگ نظری اور کٹر پسندی کی۔ فارسی شاعری سماج میں پھیلی ہوئی بداخلاقیوں سے اپنا دامن نہیں بچا سکی۔ وہ اس میں بھی در آئی ہیں۔

یہ بھی بڑا دلچسپ ہے کہ تخلص پر بھی اختلاف ہوا۔ کچھ شعرا نے تخلص تبدیل کرنے پر سمجھوتا

کرلیا، بعض لے دے کر اپنے تخلص سے دست بردار ہو گئے اور بعضوں نے اس سلسلے میں زور زبردستی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بازی انہی کے ہاتھ رہی۔ یہ بھی ہوا کہ ایرانی شعرا نے وطن لوٹ کر اپنا سابقہ تخلص ہی اختیار کرلیا اور گویا یہ ایک کھیل تھا جو مصلحتاً کھیلا جاتا رہا۔ شرف انسانی کے لیے ایسے ایسے منطقی اور جذباتی نغمے گائے کہ خود انسان کو اپنی بھولی ہوئی عظمت اور امتیازی شان پر فخر ہونے لگا۔ اس طرح سماج میں اونچ نیچ کے احساس بد پر بھی کاری ضرب لگی۔ فارسی شاعری کا یہ انسان ساز پہلو نہایت ارزشمند ہے۔ شعرا نے تاریخ بھی نظم کی اور بعض ایسے تاریخی اور سماجی واقعات نظم کیے، جنہیں مورخین نے شاید غیر اہم سمجھ کر یا دربار کی مصلحت کے پیش نظر قلم انداز کردیا تھا اور ایمان داری کی بات یہ ہے کہ ہماری تہذیبی تاریخ کا معمولی سے معمولی پہلو بھی منظوم ادب ہی میں محفوظ نظر آتا ہے۔ اس طرح منظوم کلام ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک ایسا ماخذ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ہاں اس سے نتائج اخذ کرنے میں احتیاط ضروری ہے۔ شاعری میں استعارے اور مبالغے کی، جو اس کے لازمی عناصر اور ادب پارے کی عمر کئی گنا بڑھا دینے والی جمالیاتی اقدار کے امین بھی ہیں، کارفرمائیوں سے درحقیقت عہدہ برآ ہونا آسان نہیں، اس کے لیے فارسی شعریات کی نزاکتوں سے کما حقہٗ آشنائی ناگزیر ہے:

نباشد این قدر آسان بہ تحقیق سخن رفتن خدارس می شود ہر کس رسد انداز مضمون را

مشرقی ادب پر بنیادی طور پر مذہبی رنگ غالب ہے۔ فارسی ادب اس سے مستثنیٰ نہیں۔ دین و مذہب اور عرفان و تصوف فارسی تہذیب کا درخشندہ باب ہیں۔ فارسی میں مشکل ہی سے کوئی کتاب ایسی ہوگی جو حمد باری تعالیٰ سے شروع نہ ہوتی ہو۔ اس کے بعد نعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور پھر منقبت عموماً شامل کتاب نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ پوری کتابیں بھی ان موضوعات پر فارسی میں لکھی جاتی رہی ہیں اور مصنّفین نے ان موضوعات کا حق ادا کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ نعت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نظم کرنے میں بعض نہایت نادر نکات بیان کیے گئے ہیں مثلاً یہ کہ قرآن حکیم میں خداوند عالم نے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں، اس لیے اگر کوئی آپ کی مدح و توصیف کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے تو غور کیجیے وہ اس کام میں کس کا شریک و ہم کار ہے، خدا کا، نعت کہنے والے کی یہ انتہائی سعادت ہے۔

عارفانہ شاعری کی دنیا بالکل مختلف ہے۔ عرفان و تصوف فارسی شاعری کے جسم میں گویا روح

اورجان ہے۔عبدالرحیم خان خاناں سے منسوب یہ جملہ اسی احساس کا ترجمان ہے،تصوف برای شعر گفتن خوب است۔حکمت، پندونصائح اسی نوعیت کے کلام کا بھی حصہ ہیں۔اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دین دار بھی مذہبی اور اخلاقی اغراض سے مفید مقصد روایتیں گڑھنے کی اپنی استعداد بروئے کار لائے،جس کا اصل مقصد سماج کو فساد و بداخلاقی سے بچانا اور راستی،سچائی اور نیکی کی راہ دکھانا تھا۔ادب میں اس رویے کو مطعون قرار نہیں دیا جانا چاہیے۔

فنی اور ادبی بنیادوں پر شعرا نے ایک دوسرے کے کلام پر کبھی سخت اور کبھی نرم تنقید بھی کی ہے۔یہاں سے بغض وحسد اور معاصرانہ چشمک نے سر اٹھایا۔ایک دوسرے کو شخصی طور پر برا بھلا کہنے کا دروازہ بھی کھلا۔ایک دوسرے پر رکیک حملے کیے گئے۔کچھ شعرا کو یہ رویہ پسند نہیں آیا،لیکن وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ حسد شعرا کی جبلت میں شامل ہے۔اس فطری رجحان نے فارسی شاعری میں بڑا غضب ڈھایا ہے۔اس نوعیت کی شاعری سے بہر حال یہ ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ ادبی سماج اندھا اور بہرہ نہیں تھا۔پسند ناپسند،اصول و بے اصولی کا کھلے طور پر اظہار کیا جاتا تھا۔شعرا دوسروں کے کلام کو کچھ سیکھنے اور رہنمائی حاصل کرنے یا پھر اس میں کیڑے نکالنے کے لیے متواتر زیر مطالعہ رکھتے تھے۔وہ اس طرح گذشتہ صورت حال سے واقفیت اور اپنے کلام میں نئے مضامین اور تازہ معنی پیش کرنے کی سعی کرتے تھے اور شاعری کو اسی سے عبارت سمجھتے تھے۔اچھا کلام حتی کہ دور دراز کا سفر کرنے کے بعد صاحبان ذوق کے حلقوں میں بہر صورت پہنچ جاتا تھا۔اچھے شعر کو ایک دیوان کے برابر کہا جاتا تھا۔شعرا اس کا جواب دیتے تھے،کوشش کی جاتی تھی کہ کسی نہ کسی انداز سے اس سے بہتر تخلیق کیا جائے۔اس مقابلے بازی نے شاعری کے معیار پر بدیہی طور پر مثبت و مفید اثرات ڈالے۔اس عمل میں کبھی بدمزگی بھی پیدا ہوجاتی تھی۔شعری کلچر کا دلچسپ لیکن اسی کے ساتھ دردناک پہلو شعرا کی آپس کی تو تو میں میں ہے۔اسی مقابلے بازی میں شعرا نے ایک دوسرے پر خوب مناسب و نامناسب اعتراضات بھی کیے،اس کی وجہ سے شعرا کے گروہ بن گئے اور ادبی بحث و مباحثہ دراز مدت تک جاری رہا۔اسی میں فن شعر کے بعض اہم پہلو بھی زیر بحث آجاتے تھے۔اچھے شعر کی تعریف،فنی خوبیاں،زبان و بیان،معنی آفرینی اور خیال پردازی وغیرہ سب ہی موضوعات پر اظہار نظر کیا جاتا تھا۔اس سلسلے کے مباحث کو اگر جمع کیا جائے تو بہ آسانی شعر کی ماہیت و کیفیت پر ایک وقیع

کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

ایک نہایت گرما گرم موضوع سرقہ وتوارد کا تھا۔اس بحث میں صاحبان ذوق نے اپنے جس قوی حافظے اور ذہنی استحضار کا مظاہرہ کیا ہے،وہ تعجب خیز ہے۔قدیم ومعاصر شعرا کے اَن گنت ہم معنی و ہم مفہوم اور حتی کہ ہم زمین اشعار ان کی نوک زبان پر رہتے تھے۔وہ بلا تامل کلام میں تشابہ فکر ونظر کی نشان دہی کردیتے تھے۔سرقہ کی بہر صورت مخالفت کی گئی،اسے بری نظر سے دیکھا گیا لیکن توارد کو بعض اسباب سے گوارا کرلیا گیا اور اس کے جواز میں دلائل پیش کیے گئے اور کہا گیا کہ طبیعتیں ایک ہی جیسے حالات میں یکساں طور پر سوچتی اور نتائج اخذ کرسکتی ہیں اور یہ ایک طبیعی امر ہے۔اس مسئلہ پر مجموعی طور سے نظر ڈالیے تو پتہ چلتا ہے کہ ایک دوسرے کے کلام کا سنجیدگی سے مطالعہ،اس سے اثر پذیری، نادر اور پسندیدہ خیال وتصور کو بار بار اپنے ڈھنگ اور رنگ میں دہرانا ایک مستقل اور مسلسل عمل تھا۔سرقہ اور توارد بیشتر اسی عمل کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔غالب تو کہا کرتے تھے کہ میرے کلام میں توارد کا سوال ہی نہیں اور اگر کہیں توارد کا احتمال ہو بھی تو سن لیجیے کہ یہ فکر وخیال اور انداز بیان جس پر توارد کا تہمت لگایا جارہا ہے، اصلاً میرا ہی ہے،دوسروں نے میری متاع کو ازل ہی میں اڑا لیا تھا:

مبر گمانِ توارد ، یقین شناس کہ دزد متاعِ من زنہان خانۂ ازل برد است

البتہ ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض شعرا نے دوسروں کے مصرعے، پورے پورے شعر اور حتی کہ دیوان بھی اپنے سے منسوب کرلیے لیکن شعری دنیا کے قوی حافظے نے اس عمل زشت کو طشت از بام کردیا۔اس نوعیت کے مباحث میں ہندوستان کے شعرا و ناقدین کا حصہ نسبتاً زیادہ ہے۔شہنشاہ اکبر کے دور سے لے کر انیسویں صدی میں صہبائی تک متعدد ناقدین سخن نے اس میدان ادب میں کتابیں لکھی ہیں اور اپنا لوہا منوایا ہے۔اس کی مثال خود ایران میں بھی غالباً نہیں ملتی اور ادبی تنقید پر تحقیقی کام انجام دینے والے ایرانی فضلا نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

جس دور کی فارسی شاعری (کلاسیکی) سے اس وقت معاملہ ہے وہ شخصی حکومتوں اور مطلق العنان دور کی پیداوار ہے۔اس دور میں عام انسان کے ساتھ بہت ناروا سلوک رکھا گیا اور یہ بے چارہ اور بے دست وپا حاکم طبقے کا غلام بنے رہنے پر مجبور رہا۔ناسازگار حالات کی بنا پر وہ یہ بھول گیا کہ اس کی اپنی ہستی بھی ہے۔ایسے ناروا حالات میں شعرا اور صوفیہ اس کی دست گیری کے لیے سامنے آئے۔

انہوں نے نہ صرف خود بلکہ اپنے ماننے والوں کو بھی خدمت خلق پر ابھارا اور ان میں حاکم طبقے کے چند روشن فکر افراد بھی شامل تھے۔ شعرا تو بہ آواز بلند یہی تکرار کرتے رہے کہ:

مرد بی برگ و نوا را سبک از جای مگیر کوزۂ بی دستہ چو بینی بدو دستش بردار

شعرا نے انسان کو اس کی عظمت، اشرف المخلوقات ہونے کی حقیقت اور اس طرح مخلوق خدا میں اس کی انفرادی اور امتیازی شان خودا سے اور حاکم طبقے کو یاد دلانے کے لیے پیہم جدو جہد کی۔ فارسی شاعری میں اس نوعیت کے افکار کی گونج اوائل ہی سے سنائی دیتی ہے اور آخر تک ایک تحریک کے طور پر جاری رہتی ہے۔ اس ضمن میں حد تو یہ ہے کہ یہاں تک کہا جاتا رہا کہ انسانی عظمت کے اعتراف ہی پر ایمان موقوف ہے۔ اسی تصور و عقیدے نے انسان دوستی کے احساس کو جنم دیا۔ انسان دوستی شعرا کی نظر میں باری تعالیٰ کی خوش نودی حاصل کرنے کا سب سے بڑا اور موثر ذریعہ تھی۔ یہ اسلامی تعلیمات کا پرتو بھی ہے۔ فارسی شاعری میں اس موضوع پر جس قدر زیادہ زور دیا گیا ہے، اس کی مثال شاید دوسری زبانوں کی شاعری میں ملنا آسان نہیں۔ فارسی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو بہ آسانی یہ ادراک ہوتا ہے کہ انسانی عظمت اور انسان دوستی پر تاکید کرنا شعرا نے اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔ مذہبی عقاید کی بنیاد پر اختلاف ونفاق کو بھی بے معنی قرار دیا گیا اور بار بار اعلان کیا جاتا رہا کہ:

ما بہ ہفتاد و دو ملت صلح کل داریم و بس جادہ ای دارد بہر مذہب طریقِ دینِ ما

کشمیر کے غنی بیگ قبول بھی اصرار کرتے تھے کہ:

شیعہ و سنی و ملحد نیستم کم کسی داند کہ این ہم مشربی است

اس ضمن میں نظیری نیشاپوری کا قول ہے:

از مذہبم مپرس نہ مومن نہ کافرم من رسم این دیار ندانم مسافرم

شاعر کو لاکھ تلمیذ الرحمان کہا جاتا رہا ہو (اور یہ شاید کسی شاعر ہی نے کہا ہوگا)، پھر بھی دلچسپ ہے، یہ موضوع کہ خود شعرا نے اگر شاعر و شاعری کی تعریف و تحسین کی ہے تو وہیں اس کی مذمت بھی کی ہے۔ منظوم کلام کے اس پہلو کی مذمت نظر آتی ہے جسے مدح وذم بے جا کہا جانا چاہیے۔ بے محل مدح کرنے والے شعرا کو خود شعرا نے بہت کوسا اور برا بھلا کہا ہے۔ یہ خصوصیت فارسی شاعری کی نہایت قابل قدر ہے کہ اس کے خالق سماج کے مختلف طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ فرماں روا، مختلف پیشہ ور

جیسے معلم، خوش نویس، بڑھئی، سوزن گر، طبیب، نقاش، جلد ساز، نان بائی، سپاہی، کفش ساز، حداد (لوہار)، امام، درزی وغیرہ۔ فارسی سماج میں پیشے کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ ہر شخص نے بغیر کسی احساس کمتری کے اپنے اپنے پیشوں اور حرفت پر فخر کیا اور اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ سماجی توازن برقرار رہا جو علمی و ادبی ترقی کے لیے ایک ناگزیر ضرورت ہوا کرتا ہے۔ یہ خلاصہ ہے فارسی شاعری کے تہذیبی منظرنامے کا۔

دربار سے وابستہ فارسی شعرا کا تذکرہ "اشارات بینش" تھا یہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دہلی میں مدفون مشائخ کا تذکرہ "ذکر جمیع اولیای دہلی" مرتب کیا۔ پھر والہ داغستانی کے "ریاض الشعرا" کی تصحیح کی اور اس کے بعد "حدیقۂ ہندی" کو مرتب کرنے کا موقع بھی ملا۔ ان تذکروں پر حواشی و تعلیقات لکھنے کے لیے متعلقہ دستیاب تذکروں سے رجوع کیا۔ اس مطالعے کے دوران تذکروں میں جو مواد راقم کو کسی بھی لحاظ سے فارسی تہذیب کے سلسلے میں دلچسپ اور کارآمد لگا اسے نقل کرتا رہا۔ اسی مواد کو پیش نظر کتاب میں ایک ایک خاص ترتیب سے مختلف عنوانات کے تحت اردو میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے مآخذ کی نشان دہی کردی ہے۔ ہر عنوان کے شروع میں اس کے تحت زیر بحث آنے والے مطالب کا خلاصہ لکھا ہے۔ تذکروں میں بیانات پر کوئی خاص اظہار نظر کرنے سے اجتناب کیا ہے اس لیے کہ یہ ایک مفصل اور جداگانہ تحقیق کا متقاضی اور پیش نظر کتاب کے مقصد و منہاج سے ماورا بھی ہے۔

امید ہے کہ یہ مستند مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اور فارسی دنیا کے سماجی رویوں اور فارسی شاعری کے تہذیبی منظرنامے کی افہام و تفہیم میں مدد و معاون ثابت ہوگا اور یہی اس کاوش کا اصل مقصد ہے۔

حواشی

(۱) راقم کی ایک زیر اشاعت کتاب "فارسی شاعری: تہذیبی منظرنامہ" کا یہ مقدمہ ہے جو یہاں پیش خدمت ہے۔

(۲) فارسی شاعری کی ابتدا اور اس کے ارتقائی مدارج پر حافظ محمود شیرانی کا گراں قدر تحقیقی مقالہ "فارسی شاعری اور اس کی قدامت" دیکھا جاسکتا ہے، رک، مقالات حافظ محمود شیرانی، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ج ۵، ۱۹۷۰ء، ص ۶۹۷-۶۶۹۔

مطالعۂ گیلانی
چند ضروری باتیں

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی ☆

علامہ سید مناظر احسن گیلانی اپنے عظیم علمی کارناموں کی وجہ سے ہندو بیرون ہند میں شہرت ومقبولیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ علامہ کی ذات وصفات پر ہونے والی تحقیق اور ان کے علمی وفکری سرمایوں پر ہونے والی تنقید وتجزیہ ابھی بہت ناقص اور ناکافی ہے تاہم محققین وناقدین نے انہیں اپنا موضوع بنایا جس سے بہت سے مضامین ومقالات اور کتابیں سامنے آگئیں۔ کچھ یونیورسٹیوں نے بھی اس جانب توجہ مبذول کی اور اپنے اسکالروں کو سند تحقیق عطا کی۔ چونکہ علامہ گیلانی کی ذات وکمالات سے راقم کی بھی ایک زمانے سے دلچسپی رہی ہے اور ہے، اس لیے کچھ خامہ فرسائی کی کوشش کی جارہی ہے۔ دوران مطالعہ مجھے بہت سے تضادات اور تسامحات ایسے نظر آئے جن کی وضاحت اور ازالہ ضروری ہے۔ ورنہ وقت کے ساتھ بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں اور ان کا تدارک ایک دشوار گزار امر بن جاتا ہے۔ درست بات تو یہ ہے کہ علامہ گیلانی کے سلسلہ میں اچھے خاصے عالم فاضل حضرات نے کئی غلط فہمیوں کو جنم دیا اور سنی سنائی بے سند باتیں لکھ دی گئیں۔ مثال کے طور پر ان کے نام کا صحیح تلفظ کیا ہے؟ مناظر میں میم پر زبر ہے یا پیش؟ ان کی صحیح تاریخ پیدائش کیا ہے؟ گاؤں کا نام گیلانی ہے یا گیلان؟ یہ گاؤں ضلع مونگیر کا حصہ ہے یا پٹنہ (نالندہ) کا؟ حیدرآباد میں مدت قیام کتنی ہے؟ وفات کے بعد چہرے کا جوانوں جیسا ہوجانا اور داڑھی کا سفید ہوجانا وغیرہ؟ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علامہ کے شاگرد ہیں؟ علامہ گیلانی کے شاگردوں میں ایک نام مخدوم محی الدین کا بھی ہے۔ کیا یہ وہی اشترا کی مخدوم ہیں یا کوئی اور؟

☆ شعبۂ اردو، رام لکھن سنگھ یادو کالج، بتیا (مغربی چمپارن)۔

دراصل ان تسامحات کے پس پردہ بھی کچھ وجوہات ہوتی ہیں۔کبھی تو گنجلک الفاظ اور جملے ہی مغالطوں کا باعث ہوتے ہیں اور کبھی لکھنے والوں کی بے توجہی اور قیاس آرائیوں سے یہ چیزیں جنم لیتی ہیں، اور کبھی کبھی سرحدیں بھی درست معلومات کے درمیان آڑے آجاتی ہیں۔مثلاً علامہ کا نام ''مناظر'' اور اپنے گاؤں کی نسبت ''گیلانی'' ہے۔یہ دونوں الفاظ ذرا پیچیدہ ہیں اور غلطیوں میں پڑنے کا امکان غالب ہے۔اس لیے کہ اردو میں اعراب تو ہوتا نہیں تو اب آپ اسے ''مُناظر'' بروزن مقابل بھی پڑھ سکتے ہیں اور ''مَناظر'' بر مساجد بھی اور دونوں ہی تلفظ اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔اسی طرح ''گیلانی'' کا لفظ۔قاعدے کے مطابق اس میں آخری ''ی'' یائے نسبتی ہے، اگر اس ''ی'' کو حذف کر دیا جائے تو لفظ ''گیلان'' باقی رہ جاتا ہے۔اس لحاظ سے علامہ کے گاؤں کا نام کوئی ''گیلان'' لکھ دے تو وہ عین قرین قیاس ہے۔

کچھ غلطیاں قیاس آرائیوں کی بنا پر در آتی ہیں اور اس کا رواج اس قدر عام ہو جاتا ہے کہ اصل کو لوگ بھول جاتے ہیں اور غلط ہی کو ذہن اصل سمجھ بیٹھتا ہے۔اب ہم ذیل میں علامہ گیلانی کے سلسلے میں محققین و مصنّفین سے جو تسامحات و مغالطے سرزد ہوئے ہیں، ان کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

بہت سے وہ احباب علامہ گیلانی کے سلسلے میں اس طرح کے سوالات کرتے رہتے ہیں جنھیں علامہ کے علمی کارناموں سے دلچسپی ہے۔علامہ گیلانی کے نام کے بارے میں بھی طلبہ اور اسکالر تذبذب کے شکار نظر آتے ہیں۔ایک زمانے تک میں بھی یہی سمجھتا رہا کہ ان کا نام میم کے پیش کے ساتھ مُناظر ہے اس لیے کہ قاعدہ یہی بتاتا ہے گرچہ اردو میں کم ہی سہی جمع الفاظ کے ساتھ نام رکھنے کا رواج بھی ملتا ہے۔مثال کے طور پر اسرار، ابرار وغیرہ۔لیکن درحقیقت خلاف قیاس علامہ کا نام میم کے زبر کے ساتھ مَناظر ہے۔ان کا یہ نام مناظر احسن (۱۳۱۰ھ) تاریخی ہے۔تاہم اس ابجدی ترتیب میں زبر زیر کی تبدیلی سے تاریخ کی تعیین میں کوئی فرق نہیں آتا۔علامہ گیلانی کے معروف شاگرد ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی نے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی ہے:

> ''مناظر احسن (۱۳۱۰ھ) آپ کا تاریخی نام ہے۔(میم کے زبر کے ساتھ) اور ماشاء اللہ اسم بامسمی ہیں''۔(''مقدمہ'' امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، علامہ سید مناظر احسن گیلانی، مکتبہ الحق، دیوبند (۲۰۰۴) چوتھا ایڈیشن)

اسی طرح مشہور محقق ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے بھی اپنی کتاب ''مولانا سید مَناظر احسن گیلانی: شخصیت وسوانح'' میں بھی میم کے زبر ہی کے ساتھ لکھا ہے۔

علامہ کے گاؤں کا نام ''گیلانی'' ہے۔ قاعدے کی رو سے یائے نسبتی کے ساتھ ''گیلانوی'' کا لفظ ہونا چاہیے اور بعض مقامات پر ابتدا میں انہوں نے ایسا لکھا بھی ہے۔ جیسا کہ علامہ کی اولین نظم ''شکوۂ خواجہ'' کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں (۱۹۱۳) کے سرورق پہ لکھا ہے: ''مولانا سید ضیاء محمد مناظر احسن گیلانوی بہاری''۔ علامہ ابتدا میں ضیاء تخلص فرماتے تھے۔ اس کی تائید ان کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے۔ (خط بنام اہلیہ مولوی سید محمد یعقوب صاحب وکیل۔ مکاتیب گیلانی، مرتب مولانا منت اللہ رحمانی، دارالاشاعت رحمانی، مونگیر، ۱۹۷۲، ص ۸۳)

علامہ کے گاؤں کا اصل نام گیلانی ہے نہ کہ ''گیلان''۔ ایران سے سید ندیم الدین ایران کے خطۂ گیلان سے اپنے بیٹے سید شہاب الدین اور پوتے سید منہاج الدین کے ہمراہ دہلی آئے، منہاج الدین بعد میں بہار تشریف لائے اور موجودہ گیلانی کا خطہ انہیں پسند آیا اور انہوں نے ہی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس خطے کا نام ''محی الدین پور گیلانی'' رکھا، بعد میں محض گیلانی رہ گیا۔ مزید تفصیل مظفر گیلانی کے مضمون ''مولانا مناظر احسن گیلانی: حیات اور شخصیت'' (مطبوعہ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، نومبر و دسمبر ۱۹۸۶) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

علامہ کے ایک شاگرد ڈاکٹر غلام محمد نے ان کی کتاب ''تذکرۂ شاہ ولی اللہ'' کے دیباچہ میں علامہ گیلانی کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۴ لکھ دی ہے جبکہ انہوں نے اپنے ہی ایک دوسرے مضمون ''تذکرۂ احسن'' میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۲ تحریر کی ہے اور یہی صحیح ہے۔ (مقالات احسانی، علامہ سید مناظر احسن گیلانی، ادارہ مجلس علمی، کراچی (۱۹۵۷) ۱۰ ۱۳ھ کو اگر عیسوی میں بدلا جائے جب بھی ۱۸۹۲ ہی آتا ہے۔

اسی طرح مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اپنے ایک مضمون ''آہ جَرامت'' میں علامہ گیلانی کے بارے میں یہ لکھ دیا ''مولانا ضلع مونگیر (بہار) کے ایک گاؤں گیلانی کے خاندان سادات کے چشم و چراغ تھے''۔ جبکہ صحیح یہ ہے کہ اس وقت گاؤں کا ضلع پٹنہ تھا اور اب نالندہ ہے۔ مولانا اکبرآبادی کو غلط فہمی اس لیے ہوئی ہوگی کہ علامہ گیلانی خط و کتابت میں بسا اوقات ڈاک خانہ کی جگہ استھانواں کے

بجائے بربیگھہ لکھ دیا کرتے تھے اور بربیگھہ کا ضلع مونگیر ہوا کرتا تھا۔علامہ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ گیلانی سے بربیگھہ کا فاصلہ تقریباً تین کلومیٹر کا ہے اور استھانواں کی دوری لگ بھگ دس کلومیٹر ہے۔

علامہ کی زندگی سے جڑا ایک اہم واقعہ وفات کے بعد ان کی شکل وصورت کا جوانوں جیسا ہوجانا بھی ہے۔اس واقعہ کی بنیاد علامہ کے چھوٹے بھائی سید مکارم احسن کا ایک خط ہے:

> ''بہ وجہ سہ سالہ شدید مرض قلب کے لاغر ترین ہوگئے تھے۔ اول تو خاموش طریقے سے دوامی نیند آہی گئی۔دوم روح پرواز ہوتے ہی جوان وتوانا کردیے گئے۔اچانک جوان دیکھ کر ہی میں نے جانا کہ اب یہ نہیں ہیں۔فربہ سرخ چہرہ، سینہ چوڑا ابھاری، گردن موٹی، داڑھی سیاہ۔علماء نے غسل دیا تو سب کو یہ سماں دیکھ کر حیرت تھی، بعد غسل میت کمرے سے حویلی گئی، چہرہ کھول کر بستی کی اور گھر کی عورتوں نے دیکھا تو سب ایک زبان بول اٹھیں کہ یہ تو پچیس برس کے جوان ہیں۔ داڑھی سیاہ ہوجانے کا چرچا ہر طرف تھا''۔(صدق جدید،لکھنؤ،۲۱رستمبر ۱۹۵۶ بحوالہ مولانا سید مَناظر احسن گیلانی: شخصیت وسوانح، ابوسلمان شاہ جہاں پوری، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲،ص ۱۹)

علامہ گیلانی پر لکھنے والوں نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور سب کا ماخذ یہی خط رہا ہے۔علامہ کے پہلے سوانح نگار مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے بلکہ انتقال کے دن وہ گیلان میں ہی تھے لیکن سوئے اتفاق تدفین کے بعد پہنچ پائے تھے۔ ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے بھی اس خط کو نقل کیا ہے۔کچھ حضرات کو اس واقعہ کی صداقت وصحت پر تامل ہے۔جیسا کہ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے لکھا ہے:

> ''ان کی وفات سے متعلق جو کرامات مشہور ہیں ان کی کوئی شہادت مجھے نہیں ملی حالانکہ اب بھی مولانا کے براہ راست رشتہ داروں میں سے چند لوگ وہاں رہتے ہیں ......مگر کسی نے ان واقعات کی شہادت نہیں دی جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام خطوط (مطبوعہ صدق جدید،لکھنؤ، ۲۳رجون ۱۹۵۶) میں مذکور ہیں''۔(بہار کی بہار، جلد دوم، اعجاز علی ارشد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،

نئی دہلی، ۲۰۱۷ء ص ۲۳۳-۲۳۲)

سب سے پہلے تو اس نکتے کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ان خطوط کا کاتب کون ہے؟ ظاہر سی بات ہے ان کے لکھنے والے علامہ گیلانی کے ہمدرد و ہمراز اور چھوٹے بھائی سید مکارم احسن گیلانی ہیں۔ میرے خیال میں اس بابت ان سے زیادہ کس کی شہادت معتبر ہوسکتی ہے۔ ریٹائرڈ آئی اے ایس اور سابق وی سی مظفر گیلانی نے بھی اپنے طویل مضمون ''مولانا مناظر احسن گیلانی: حیات اور شخصیت'' میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ (ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، نومبر و دسمبر ۱۹۸۶) اسی طرح اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا طیب اخلاقی (امام و خطیب شاہی جامع مسجد، بہار شریف، نالندہ) ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''ابھی حال میں راقم الحروف گیلانی فاتحہ خوانی کے لیے گیا تھا اور وہاں ان کی عزیز بھتیجی اور بھتیج داماد جناب ڈاکٹر اختر صاحب سے ملاقات و گفتگو ہوئی تو ان دونوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اس واقعہ کا خود ذکر کیا''۔ (سہ ماہی فکر و عمل، بہار شریف، جولائی۔ستمبر ۱۹۹۲)

صاحب ''حیات گیلانی'' کے صاحبزادے مولانا احمد سجاد قاسمی صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ان کی مولانا شاہد روح اللہ رحمانی مرحوم سے بھی اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی تھی، مولانا رحمانی علامہ گیلانی کے حقیقی بھانجے تھے اور ان کی تجہیز و تکفین میں بھی شامل رہے، بلکہ وفات والی رات دیر تک ماموں بھانجے سے باتیں کرتے رہے اور فانی کے اشعار بھی سنتے رہے۔ انھوں نے مولانا احمد سجاد صاحب کو بتایا کہ وفات کے بعد واقعتاً ماموں کی صورت رات والی شکل سے بالکل الگ تھی اور جوانوں کا سا چہرہ لگ رہا تھا، البتہ سیاہ داڑھی کے بارے میں مجھے زیادہ دھیان نہیں ہے۔ ویسے ''کرامات الاولیاء حق'' کے تحت اس طرح کے واقعات کا صادر ہونا بعید بھی نہیں تاہم چہرہ جوانوں جیسا ہونے کے لیے داڑھی کا سیاہ ہونا ہی ضروری نہیں ہے۔

اسی طرح علامہ گیلانی کے ایک شاگرد مخدوم محی الدین گزرے ہیں جو ان کے مبیضہ نویس تھے اور اکلوتے مرید بھی۔ جیسا کہ ایک دوسرے شاگرد ڈاکٹر غلام محمد حیدرآبادی نے مقالات احسانی کے مقدمہ میں لکھا ہے:

”صرف مخدوم محی الدین صاحب بی اے (عثمانیہ) مولانا کے مبیضہ نویس اور شاگرد عزیز کو آخر زمانہ میں حضرت گیلانی سے بیعت کا شرف مل سکا تھا اور بس“۔(مقدمہ مقالات احسانی،ص ۱۹)

”مجموعہ خطوط گیلانی“ میں اس کے فاضل مرتب محمد راشد شیخ صاحب نے مخدوم محی الدین کے نام علامہ گیلانی کا ایک خط بھی درج کیا ہے اور حاشیے میں مخدوم کی سنہ پیدائش و وفات (۱۹۰۸۔۱۹۸۹) تحریر کی ہے جو دراصل مشہور اشتراکی شاعر مخدوم محی الدین کی تاریخ پیدائش ہے۔(مجموعہ خطوط گیلانی، ترتیب محمد راشد شیخ، مکتبۂ عمر فاروق، کراچی، ص ۶۵۶۔۶۵۷) علامہ نے ۱۹۴۳ میں اپنے ایک شاگرد رشید ڈاکٹر یوسف الدین حیدرآبادی کو ایک خط لکھا، جس میں انہوں نے مخدوم صاحب کی شادی میں شرکت کے لیے ان کے گاؤں ”ارکلا“ ضلع میدک جانے کا بھی ذکر کیا ہے۔(خط بنام یوسف الدین، مجموعۂ خطوط گیلانی، ص ۴۵۵)

دوسرے مخدوم محی الدین اندول ضلع میدک میں ۱۹۰۸ میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام غوث محی الدین تھا۔ان کا تعلق غریب گھرانے سے تھا، والد بچپن ہی میں وفات پا گئے، ماں نے دوسری شادی کر لی اور پرورش چچا نے کی۔۱۹۲۹ میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا، ۱۹۳۴ میں بی۔اے اور ۱۹۳۶ میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی، ان کے اساتذہ میں علامہ گیلانی بھی تھے۔(مخدوم محی الدین، حیات اور کارنامے، شاذ تمکنت، مکتبہ شعر و حکمت، حیدرآباد، ۱۹۸۶، ص ۱۷۔۱۹)

شاعر مخدوم کی سوانح میں تفصیل یہ ہے:

”مناظر احسن گیلانی دینیات کے پرفیسر تھے، جن سے وہ محض ستانے کی خاطر ایسے سوالات کرتے کہ گیلانی صاحب عاجز آجاتے۔بات یہاں تک بڑھی کہ انہیں دینیات میں ناکام کر دیا گیا اور حاضری بھی اتنی کم کہ امتحان میں بیٹھنے کی اجازت تک نہ مل سکی“۔(مخدوم محی الدین، حیات اور کارنامے، ص ۱۹)

مزید تفصیل بتاتے ہوئے سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

”عثمانیہ یونیورسٹی میں طلبہ کے لیے مضامین اختیاری کے علاوہ دینیات یا

اخلاقیات کی تعلیم لازمی تھی۔ایک مذہب پرست گھرانے کا فرد ہونے کے باوجود مخدوم کو دینیات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دینیات کی جماعتوں میں اکثر غیر حاضر رہتے۔دینیات کے پروفیسر سے مخدوم کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے۔ چونکہ مخدوم نے گھر پر باقاعدہ مذہبی تعلیم حاصل کی تھی اس لیے ان کی معلومات کی بنیادیں بہت مستحکم تھیں اور اکثر مسائل میں وہ مناظر احسن گیلانی سے جو دینیات کے استاد تھے، بحث کر کے اپنے استدلال پیش کرتے تھے۔مناظر احسن گیلانی مخدوم کے اس رویے سے خوش نہیں تھے، اس پر مستزاد یہ کہ مخدوم جماعت سے اکثر غائب رہتے۔ مناظر احسن گیلانی نے امتحان کے موقع پر مخدوم کی وہی حاضری بھیجی جوان کے رجسٹر میں موجود تھی۔مخدوم انٹرمیڈیٹ کا امتحان دینے سے قاصر رہے کیونکہ ان کی حاضری ۶۰% سے بھی کم تھی۔اس طرح مخدوم کا ایک سال رائیگاں گیا جس کی انہیں بڑی کوفت تھی''۔(مخدوم محی الدین، سیدہ جعفر، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۹۸، ص ۱۴۔۱۵)

سیدہ جعفر نے مخدوم کے مذہبی خیالات کے بارے میں لکھا:

''مخدوم کو بقول اندرا دھن راج گیر''خدا سے کوئی خاص لگاؤ یا دلچسپی نہیں تھی''......لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دہریے تھے''۔(ایضاً، ص ۳۶)

دونوں مخدوم کا تعلق ضلع میدک سے ہے، دونوں جامعہ عثمانیہ کے طالب علم رہے اور دونوں علامہ مناظر احسن گیلانی کے شاگرد بھی رہے ہیں، لیکن یہاں دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا یہ دونوں ایک ہی شخص ہیں یا دو الگ الگ شخصیت؟

دراصل ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے اپنی کتاب ''مولانا سید مَناظر احسن گیلانی: شخصیت وسوانح''(ص ۲۰۔۲۱) پر اور مجموعہ خطوط گیلانی (ص ۶۵۷) پر درج اس خط کے حاشیے میں مخدوم محی الدین کی سنہ پیدائش و وفات (۱۹۰۸۔۱۹۶۹) لکھ دی ہے۔ یہ خط علامہ گیلانی نے اپنے انتقال (۵/جون ۱۹۵۶) سے صرف ایک روز پہلے مخدوم کے نام لکھا تھا۔ حالانکہ حاشیے میں مذکورہ تاریخ درحقیقت مخدوم شاعر کی سنہ پیدائش و وفات ہے۔یہیں پر دونوں محققین سے چوک ہوئی اور دونوں نے دونوں مخدوم کو ایک ہی سمجھ لیا۔

دونوں مخدوم کا ضلع ایک ضرور ہے لیکن گاؤں الگ الگ ہیں۔ دونوں علامہ کے شاگرد بھی ہیں لیکن ایک مبیضہ نویس ہے اور دوسرا بے جا سوال کر کر کے استاذ کو پریشان کرتا ہے۔ ایک سے اتنے خوش ہیں کہ اس کی شادی کی تقریب میں علامہ اس کے گاؤں پہنچ جاتے ہیں اور دوسرے سے نالاں اور ناخوش ہیں، اسی طرح ایک مذہب بیزار ہے تو دوسرا استاذ کا مرید۔ سچی بات یہ ہے کہ دونوں مخدوم الگ ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مخدوم اشترا کی پر تحریر کردہ کئی کتابیں میں نے دیکھیں ساری سوانح اس تفصیل کے بیان کرنے سے خاموش ہیں۔ ان کی مذہبیات کے ضمن میں بھی مرید بننے کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ الٹا ان کی مذہب بیزاری کی وضاحت ضرور ملتی ہے۔ دوسری دلیل علامہ گیلانی کا آخری خط ہے جس میں ایک جگہ یوں لکھا ہے:

> ''بال بچوں کی پرورش، والدہ ماجدہ کی خدمت آپ کے اہم فرائض میں ہے۔ فرائض سے لاپرواہی اختیار کر کے نوافل میں مشغولیت نہ شرعی کام ہوا نہ عرفی''۔ (مجموعہ خطوطِ گیلانی، ص ۷۵)

دونوں کی شادی کی تاریخ میں بھی بڑا فرق ہے۔ مخدوم شاعر کی شادی ۱۹۳۳ میں ہوجاتی ہے اور ڈاکٹر یوسف الدین کے نام علامہ گیلانی نے جس خط میں مخدوم کی شادی میں اپنی شرکت کا ذکر کیا ہے اس پر ۱۹۴۳ کا سنہ درج ہے۔ ان تمام تفصیلات سے واضح ہوجاتا ہے کہ دونوں مخدوم ایک نہیں ہیں دونوں کی شخصیت الگ الگ ہے۔

ایک بار محاضرے کے دوران میرے استاذ محترم مولانا عبدالخالق سنبھلی صاحب نے فرمایا تھا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علامہ گیلانی کے شاگرد رہے ہیں۔ اسی وقت سے مجھے جستجو رہی کہ کہیں اس کی کچھ وضاحت ملے۔ ایک مدت کے بعد علامہ کے خطوط میں قدرے وضاحت ملی۔ صحیح بات یہ ہے کہ مولانا مودودی علامہ کے باضابطہ شاگرد نہیں ہیں، البتہ ان کا نیازمندانہ تعلق علامہ گیلانی سے ضرور رہا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابواللیث علامہ گیلانی کے شاگرد تھے۔ جیسا کہ ایک خط میں علامہ گیلانی نے ذکر کیا ہے:

> ''مولانا ابواللیث امیر ہند خاکسار کے شاگرد ہیں، قرآن پڑھنے کے لیے گیلانی آئے تھے اور مولوی ابوالاعلیٰ صاحب سے بھی خاکسار ذاتی نیازمندی کا تعلق

رکھتا ہے‘‘۔(خط بنام حکیم سید محمود احمد برکاتی، مجموعہ خطوط گیلانی،ص ۴۲۷)

علامہ گیلانی کی ایک عادت یہ بھی رہی کہ وہ خردنوازی اوران خردوں کی حوصلہ افزائی میں اپنی بہت سی نظمیں وغیرہ ان کے نام سے شائع کردیا کرتے تھے،لیکن یہ ایک انتہائی عرق ریزی کا کام ہے۔الحاصل ان کی ایک نظم ہے’’اسلام کی روانی‘‘ جو قاری محمد طیب قاسمی کے نام سے ماہنامہ ’’القاسم‘‘ (ربیع الاول ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۷) دیوبند میں شائع ہوئی، یہ نظم ان کے شعری مجموعہ’’عرفان عارف‘‘میں بھی شامل ہے لیکن درحقیقت یہ علامہ گیلانی کی نظم ہے۔مظفر گیلانی لکھتے ہیں:

’’مولانا کی ایک اور مشہور نظم’’اسلام کی روانی‘‘ ہے جو اکبرالہ آبادی کی مشہور نظم’’پانی کی روانی‘‘ کے انداز پر لکھی گئی تھی اور کافی مقبول ہوئی۔شاید یہ نظم’’القاسم‘‘ دیوبند میں شائع ہوئی تھی‘‘۔(ماہنامہ الفرقان لکھنؤ،نومبر ودسمبر ۱۹۸۶)

دلائل کی روشنی میں یہ چند باتیں اہل علم وفضل کی خدمت میں پیش کرنی تھی۔توقع ہے کہ یہ سلسلہ مزید دراز ہوگا اور آیندہ بھی علامہ سید مناظر احسن گیلانی اوران کے دیگر معاصرین کے غبار آلود پہلوؤں کو صاف کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم
شخصیت و علمی خدمات کے کچھ اہم پہلو

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی☆

پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم (۹؍فروری ۱۹۵۳ء۔ ۲۹؍دسمبر ۲۰۲۰ء) سے میری پہلی ملاقات (جہاں تک مجھے یاد ہے) ۱۹۹۱ء میں جامعہ سلفیہ (وارانسی) کے زیر اہتمام ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کی سربراہی میں منعقدہ سیرت کانفرنس میں شرکت کے دوران جامعہ اسلامیہ میں حاضری پر ہوئی تھی۔ بعد میں علمی پروگراموں کے علاوہ اہل قرابت سے ملاقات یا کسی دوسرے کام کے لیے وارانسی جانا ہوتا تو رفقائے کرام سے ملاقات کے لیے دینی تعلیم کے دونوں مراکز میں حاضری دینے کی کوشش کرتا۔ جامعہ اسلامیہ کے اساتذہ کرام میں معروف عالمِ دین، مدیر سہ ماہی ''ترجمان الاسلام'' اور متعدد کتب کے مصنف مولانا نظام الدین اسیر ادرویؒ (وفات ۲۰؍مئی ۲۰۲۱ء) سے پروفیسر ظفر صاحب مرحوم کے بہت قریبی روابط تھے، جامعہ اسلامیہ سے شائع ہونے والے مجلہ کے وہ مستقل قلمی معاونین میں سے تھے۔ یہ مجلہ میرے زیر مطالعہ رہتا تھا، اس میں پروفیسر ظفر صاحب مرحوم کے مضامین نظر سے گزرتے رہتے تھے، اس کے توسط سے ان سے روابط بڑھے، انھی کی خواہش پر میں بھی کبھی کبھار اپنی کاوشیں اس مجلہ کے لیے ارسال کر دیتا تھا۔ ان کی وفات پر محترم پروفیسر اختر الواسع صاحب کا یہ بیان:

''پروفیسر ظفر احمد صدیقی جب بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے تو بھی وہاں مدرسہ اسلامیہ میں رضا کارانہ طور پر تعلیم دیتے تھے'' (۱) پڑھا تو مرحوم سے اولین ملاقاتوں کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ۱۹۹۷ء کے آخر میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بحیثیت استاد اُن کی وابستگی

☆سابق استاذ، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کے بعد ان سے روابط اور بڑھے، ملاقاتیں ہوتی رہیں اور تبادلۂ خیال کے مواقع بھی ملتے رہے۔ مرحوم سے ناچیز کی اُنسیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ بھی مدارس کے ان فارغین میں شامل تھے جنھوں نے مروجہ دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد عصری تعلیم سے مستفیض ہونے میں دلچسپی لی۔ مرحوم مطالعہ کے بڑے شائق تھے، کتب بینی ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور تحقیقی ذوق تو ان کے مزاج میں رچا بسا ہوا تھا۔ یہ بخوبی معروف ہے کہ ادارہ علوم اسلامیہ (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی لائبریری اسلامی و مشرقی علوم، تذکرہ و سوانحی ادب (مرحوم کی دلچسپی کے خاص میدان) اور دوسرے موضوعات پر عربی، فارسی، اردو و انگریزی کی قدیم و جدید کتابوں کا نہ صرف بے مثال مخزن ہے، بلکہ دوسرے شعبہ جات کے اساتذہ و محققین کو فیض رسانی کے لیے بھی مشہور ہے۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب وقتاً فوقتاً اس لائبریری سے استفادے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ان سے ملاقات اور سلام و کلام کا یہ بھی ایک ذریعہ تھا اور حسن اتفاق کہ میرا کمرہ لائبریری کے بالکل قریب تھا، اس لیے لائبریری میں آنے جانے والوں پر نظر پڑ جاتی تھی۔ مزید یہ کہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سمیناروں، توسیعی خطبات اور دوسرے علمی پروگراموں میں مقالہ نگار، مقرر/مبصّر (یا کم از کم سامع) کی حیثیت سے ہی شریک ہونا مرحوم کی علمی دلچسپیوں کا ایک حصہ تھا۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ان متلاشیان علم میں شامل تھے جنھوں نے دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد عصری تعلیم حاصل کی اور بایں طور قدیم و جدید تعلیم میں امتزاج کا ایک معروف طریقہ اپنایا۔ اس کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ دین کی بنیادی تعلیم کے تین چشموں (مدرسہ ناصر العلوم، گھوسی، چشمۂ رحمت، غازی پور، مدرسہ وصیۃ العلوم، الہٰ آباد) سے سیراب ہوکر اعلیٰ تعلیم کے لیے مظاہر العلوم، سہارنپور اور ندوۃ العلماء، لکھنؤ سے کسب فیض کیا۔ اول الذکر دینی درس گاہ سے انہوں نے دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور موخر الذکر سے عربی ادب میں تخصص کی سند حاصل کی۔ پھر عصری تعلیم کے لیے بنارس ہندو یونیورسٹی کا رخ کیا اور جدید تعلیم کے اس مشہور مرکز سے بی۔ اے، ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی تکمیل کی۔ اسی یونیورسٹی میں وہ اپریل ۱۹۷۹ء میں تدریسی خدمت سے منسلک ہوئے جو دسمبر ۱۹۹۷ء میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر کی حیثیت سے تقرری تک (تقریباً ۱۸ برس) جاری رہی۔ اہم بات یہ کہ تدریسی خدمت سے منسلک ہونے کے بعد بھی ان کی تعلیمی پیاس نہیں بجھی

اورانہوں نے ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی میں ایم۔اے مکمل کرلیا۔علی گڑھ میں انہیں ترقی کے مزید مواقع نصیب ہوئے۔ریڈر سے ترقی کر کے پروفیسر کے منصب پر فائز ہوئے اوریکم اکتوبر ۲۰۱۹ء کوانہیں صدر شعبہ کی ذمہ داری تفویض ہوئی اور ۹/اگست ۲۰۲۰ء کو رٹائرمنٹ پر وہ اس ذمہ داری سے سبک دوش ہوئے۔یونیورسٹی ضابطہ کے مطابق اگست ۲۰۲۰ء کے آخر تک ان کی تدریسی خدمات جاری رہیں، اس طرح دونوں یونیورسٹیوں میں ان کی تدریسی خدمات تقریباً ۴۱/ برس کے طویل عرصہ پر محیط ہیں۔

واقعہ یہ کہ دینی مدرسہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد یونیورسٹی یا کسی جدید تعلیمی ادارہ میں عصری تعلیم سے فیض یاب ہونے کے بعد کسی یونیورسٹی میں تدریسی مشاغل اختیار کرنے والے تو بہت سے اہل علم ملتے ہیں، لیکن یونیورسٹی میں تدریسی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ وقت نکال کر کسی دینی مدرسہ میں اعزازی طور پر درس وتدریس کی خدمت انجام دینے والے یعنی دینی مدارس سے عملی ربط قائم رکھنے والے کم ہی نظر آتے ہیں۔پروفیسر ظفر احمد صدیقی بلاشبہ انہی کمیاب خدّام علم دین میں سے تھے۔ان کی تدریسی خدمات کا یہ پہلو بلاشبہ انتہائی قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے جامعہ اسلامیہ، وارانسی میں ایک دو برس نہیں برسہا برس اعزازی طور پر یہ مشغلہ جاری رکھا۔خود مرحوم کے الفاظ میں "جامعہ اسلامیہ سے میرا ربط وتعلق ربع صدی پر محیط ہے، یہاں مجھے علوم عربیہ واسلامیہ کے درس و تدریس کے مواقع بھی میسر آئے اور میں اس کے گراں قدر کتب خانے سے بھی برابر مستفید ہوتا رہا" (۲) ان کی چچازاد بہن محترمہ نے ان کی اس خدمت کی ترجمانی دل نشیں اسلوب میں ان الفاظ میں پیش کی ہے: "علومِ اسلامیہ سے آباء واجداد کا پشتینی تعلق تھا، اس سے دوری کا احساس ظفر بھیّا کو تھا، اس تشنگی کو دور کرنے کی شکل یہ نکالی کہ جب تک بنارس میں قیام رہا، وہاں کے ایک مشہور دینی ادارہ جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب میں بطور اعزازی تفسیر ودینی کتب کا درس بھی دیتے رہے، تا کہ روحانی آسودگی حاصل ہو۔اس اعزازی تدریس کی مدت ۱۹۷۶ء۔۱۹۹۶ء تقریباً بیس برس ہے" (۳)۔اسی ضمن میں یہ ذکر برمحل معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلیؒ پر مرحوم کی محولہ بالا کتاب (مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار) دراصل "ترجمان الاسلام" میں بالاقساط شائع شدہ مضامین کا مجموعہ ہے اور اس کتاب کی تصنیف واشاعت کے تعلق سے ایک اہم بات یہ کہ مصنف گرامی مرحوم نے اس کا انتساب "جامعہ اسلامیہ،

بنارس'' کے نام کیا ہے۔ کتاب کے تعارف میں انہوں نے بڑے اہتمام سے اس کا ذکر کیا ہے۔ خود انہی کے الفاظ میں :

''اس کا بیشتر حصہ اسی (کتب خانۂ جامعہ اسلامیہ) کے در و بام کے درمیان بیٹھ کر لکھا گیا ہے۔ اب جب کہ گذشتہ ڈھائی سال سے بنارس کی سکونت ترک کر کے علی گڑھ میں مقیم ہوں، یہ محض حسن اتفاق تھا کہ اس پر نظر ثانی کا کام بھی جامعہ کے کتب خانہ ہی میں اختتام پذیر ہوا اور اب یہ ابتدائی سطور بھی یہیں سپرد قلم کی جا رہی ہیں۔ اسی لیے میں اپنی اس حقیر علمی کاوش کا انتساب اسی ادارے کے نام کرنا مناسب تصور کرتا ہوں''۔(۴)

پروفیسر ظفر احمد صدیقی شوق مطالعہ اور علمی دلچسپیوں کے لیے معروف تھے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اور ان کی وفات کے بعد اہل علم کے تاثرات اور بیانات میں ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں محض ایک ذاتی تجربہ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ لاک ڈاؤن کے دوران کئی ماہ تک پوسٹل نظام کے معطل رہنے کی وجہ سے ماہنامہ ''معارف'' کی ترسیل بھی موقوف رہی۔ اگست کے آخر میں کئی ماہ کے شماروں کے کچھ سِٹ علی گڑھ میں برادر مکرم پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب (ڈائرکٹر شبلی اکیڈمی و مدیر معارف) اور مجھے دستی موصول ہوئے تو ان کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ یہ شمارے سب سے پہلے ان حضرات کو دیے جائیں جو معارف کے مستقل قلمی معاونین میں سے ہیں اور جن کے مضامین موصولہ شماروں میں شریک اشاعت ہیں۔ پروفیسر ظفر صدیقی صاحب (جن کا مضمون اگست ۲۰۲۰ء کے شمارہ میں ''مثنوی: اصل، ہیئت اور حدود'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا) کو فون پر مطلع کیا کہ معارف کے کچھ شماروں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا تو انہوں نے کہا کہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں، میں خود آ جاؤں گا۔ وعدے کے مطابق وہ ''اسلام منزل'' تشریف فرما ہوئے، کافی دیر تک مجلس مکالمت رہی، ایامِ بنارس کی یادیں تازہ کیں، ان کے دیرینہ رفیق مولانا اسیر ادروی صاحبؒ کا ذکر خیر بھی ہوا اور بعض علمی مسائل پر گفتگو رہی اور اسی ملاقات میں انہوں نے شبلی اکیڈمی کے لیے ایک صاحب کا عنایت کردہ زر عطیہ بھی حوالہ کیا کہ کسی کے بدست اعظم گڑھ بھیج دیں گے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے، لیکن اس میں ''معارف'' کی قدردانی، علمی رسائل کے مطالعہ میں دلچسپی، شبلی اکیڈمی سے گہرا تعلق اور منکسر المزاجی یا

متواضع طبیعت کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔اسی ضمن میں یہ ذکر بھی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ معارف میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب کا پہلا مضمون (شبلی نعمانی۔شخصیت،افکار اور کچھ نئی باتیں) مئی ۲۰۰۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا اور اس موقر رسالہ میں ان کا آخری مضمون (مذکورہ بالا) اگست ۲۰۲۰ء کے شمارہ میں اشاعت پذیر ہوا۔

علمی حلقوں میں مطالعہ کی وسعت،علمی انہماک،تحقیقی ذوق اور تنقیدی تجزیہ مرحوم کی شناخت تھی۔ان خوبیوں کے تعلق سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ سب دراصل دینی مدارس کی تعلیم و تربیت کی دین تھی،گرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جدید جامعات سے وابستگی کے بعد ان کا تحقیقی ذوق اور تحریروں میں تنقیدی انداز پروان چڑھا اور ان کی علمی صلاحیتوں میں نکھار آیا۔ناچیز کی رائے میں دینی مدارس میں قرآن،حدیث وفقہ کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے ساتھ علمی و تحقیقی ذوق کی آبیاری بھی ہوتی ہے۔مرحوم کی علمی زندگی،ان کی تدریسی خدمات اور کتب و مقالات سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے۔یہ حسن اتفاق ہے کہ مرحوم کے تحقیقی ذوق اور اس کے نشوونما کے بارے میں مدرسہ کی تعلیم و تربیت کے اہم کردار کی بابت ان سطور کو لکھنے کے بعد مرحوم کی کتاب ''افکار و شخصیات (عہد سرسید سے عصر حاضر تک)'' کو ایک ضرورت سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اس میں گرامی قدر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کا ''مقدمہ'' نظر سے گذرا تو مولانا محترم کے احساسات اور اپنے تاثرات میں توارد دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی۔خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

> ''ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا اردو ادب و لٹریچر سے دلچسپی کا تعلق پرانا ہے اور اس میں سہولت ان کو اس بات سے بھی حاصل رہی ہے کہ ان کی بنیادی تعلیم عربی و فارسی کے مرکزوں میں ہوئی،ان کا ادبی ذوق وہاں سے بنا،پھر عصری لٹریچر کا مطالعہ بھی انہوں نے کیا،خاص طور سے تنقید کے موضوع سے اچھی شناسائی حاصل کی،ان اسباب کی بنا پر ان کے اسلوب تحریر و طریقۂ تحقیق دونوں کو جلا ملی،ان کی عبارت میں سلاست اور سہل انگاری آئی،پھر اردو کے شعبہ میں تدریس کے فرائض انجام دینے اور یونیورسٹی کی فضا میں کیے جانے والے تحقیقی و تصنیفی کام سے قریب سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان کی صلاحیتِ کار میں مزید خوبی آئی،اس کو ان کے مضامین اور اسلوب

تحقیق میں محسوس کیا جا سکتا ہے‘‘۔(۵)

ان سب کے علاوہ مرحوم نے خود اپنی ایک کتاب (تحقیقی مقالات) کے پیش لفظ میں کھل کر یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کی تحریر میں ربط و نظم کے کچھ نمونے ملتے ہیں یا تحقیق کی جھلکیاں نظر آتی ہیں تو یہ مظاہر العلوم کے بعض اساتذہ کی تعلیم و تربیت کی دین یا ان کے درس سے فیض یابی کا اثر ہے۔ دیارِ مشرق کے ممتاز عالم دین و مشہور محدث مولانا محمد یونس جونپوریؒ (م ۱۷؍ جولائی ۲۰۱۷ء) کے ذکر خیر میں ان کے شاگرد عزیز اپنی تالیف ’’تحقیقی مقالات‘‘ کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

’’ استادِ گرامی حضرت مولانا محمد یونس صاحب بارک اللہ فی نشاطاتہ و متّعنا بفیوضہ، شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارن پور عصر حاضر کے بلند پایہ محدث بلکہ حافظ، حجت اور سند ہیں، ان کا درس حدیث مباحث کی ترتیب و تہذیب، جامعیت اور تحقیق کے لحاظ سے بے مثال ہوتا ہے۔ افسوس کہ یہ ناچیز اپنی کم ہمتی و بے حوصلگی کی وجہ سے علم کے اس چشمۂ حیات سے جیسا کہ چاہیے، فیض یاب نہ ہو سکا، لیکن طبیعت کو ربط و نظم سے یک گونہ مناسبت ضرور حاصل ہوگئی۔ ان مضامین میں اگر اس کی کچھ جھلک نظر آتی ہے تو یہ آں مخدوم کا فیضان نظر ہے‘‘۔(۶)

پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم کی علمی یادگاروں میں ۲۷؍ کتب اور سیکڑوں مقالات و مضامین شامل ہیں۔ علی گڑھ کو شہر علم کہا جاتا ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی عصری و دینی تعلیم کے امتزاج کے ایک قدیم و عظیم مرکز کی حیثیت سے بھی ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ واقعہ یہ کہ علمی فتوحات کے لحاظ سے سرزمین علی گڑھ میں بڑی زرخیزی ہے، بشرطیکہ تعلیم کا شغف رکھنے والے اور زیور علم سے آراستہ ہونے والے اس کی قدر کریں اور اس سے فیض یابی میں اپنی صلاحیتیں صحیح طور پر استعمال کریں۔ محترم ظفر صاحب مرحوم کی علمی فتوحات سے بھی اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ان کی علمی یادگاروں کی زمانی ترتیب یا ان کے سن اشاعت پر نظر ڈالنے سے سرزمین علی گڑھ کا فیض نمایاں ہو جاتا ہے، یعنی ان میں بیشتر کی اشاعت ان کے ایام علی گڑھ سے تعلق رکھتی ہے، ان کی معروف مطبوعہ کتب یہ ہیں: تنقیدی معروضات، شبلی، مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، شبلی معاصرین کی نظر میں/شبلی شناسی کے اولین نقوش، شبلی کی علمی و ادبی خدمات، تحقیقی مقالات، افکار و شخصیات (عہد سرسید سے عصر حاضر تک)، مقالات نذیر، نقش معانی،

شرح دیوان اردوئے غالب/ سید حیدر علی نظم طباطبائی، انتخاب مومن، انتخاب کلام آبرو، دیوان ناظم، قصیدہ۔ اصل ہیئت اور حدود، ابتدائی عربی۔ اسلامی و مشرقی علوم اور شعروادب کے علاوہ صدیق مکرم کو تذکرہ وسوانح سے خصوصی دلچسپی تھی، شخصیات پر تحریری صلاحیتیں استعمال کرنے کا انہیں خاص ذوق تھا۔ ان کا مطبوعہ سرمایہ اس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ دوسرے ان کی تصانیف کے مشتملات مطالعہ کی وسعت، تحقیق سے گہرے شغف، علمی انداز بیان، زبان واسلوب کی سادگی، جدید طرز نگارش سے آگاہی اور مستند مآخذ تک رسائی کے شواہد پیش کرتے ہیں۔

مرحوم کی تصانیف کی خصوصیات تک رسائی کے لیے میں نے ان کی دو کتابوں ''افکار و شخصیات'' اور ''تحقیقی مقالات'' (جن میں مختلف دور کے علماء واسکالرس اور ان کی دینی وعلمی خدمات زیر بحث آئی ہیں) کا خاص طور سے مطالعہ کیا تو ان کی تصنیفی وتالیفی کاوشوں کے یہ امتیازات سامنے آئے: وسعت مطالعہ، کسی بھی موضوع پر اظہار خیال میں بنیادی ومستند مآخذ تک رسائی، زیر بحث موضوع یا زیر مطالعہ کتاب پر مختلف پہلوؤں سے بحث، مآخذ سے جمع کردہ مواد کا ناقدانہ تجزیہ، کسی ایک موضوع پر متعلقہ مآخذ میں منقول مختلف روایات یا مصنّفین کے مختلف بیانات کا محاکمہ، کسی مسئلہ یا معاملہ میں ان کی اختلافی آراء میں سے کسی ایک کو نقلی وعقلی دلائل کی بنیاد پر ترجیح دینا، آخر میں حاصل مطالعہ کے طور پر پوری بحث کا جامع خلاصہ پیش کرنا، ہر مقالہ یا باب کے آخر میں حواشی ومراجع مرتب کرنے کا اہتمام کرنا اور مآخذ کا باضابطہ مکمل حوالہ دینا۔

اولین کتاب ''افکار وشخصیات (عہد سرسید سے عصر حاضر تک)'' (مطبوعہ رضا لائبریری، رام پور) میں جدید دور کی کچھ ممتاز شخصیات کی دینی وعلمی خدمات زیر بحث آئی ہیں ہے اور قرآن وحدیث اور عربی ادب پر بعض کتب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ زیر مطالعہ کتب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' بھی شامل ہے۔ ۲۵ رصفحات پر مشتمل ''ترجمان القرآن'' کا یہ مبسوط مطالعہ مباحث، منہج تحقیق انداز بیان اور زبان کی شگفتگی ہر اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے، مختلف پہلوؤں سے اس تفسیر کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم نے سب سے پہلے یہ واضح کیا ہے کہ مولانا آزاد نے اصلاً قرآن کریم سے متعلق اپنے مطالعات وافادات پر مشتمل تین کتابوں (مقدمۂ تفسیر، البیان اور ترجمان القرآن) کی تالیف کا منصوبہ بنایا تھا۔ اول: فن تفسیر کے اصولی مباحث پر، دوسری: ایک

مبسوط تفسیر، تیسری: آیات قرآنی کی ترجمانی مع ضروری تشریحات وتوضیحات حواشی کی صورت میں۔ پھرانہوں نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ مولانا آزاد کا اصل منصوبہ گوناگوں مصروفیات اور بعض دیگر موانع کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا اور صرف ''ترجمان القرآن'' ہی منصۂ شہود پر آسکا اور وہ بھی نامکمل صورت میں۔ لاہور سے دو جلدوں پر مشتمل اس کی پہلی اشاعت میں سورۃ المومنون تک کی ترجمانی وتشریح شامل ہے، جب کہ مالک رام کی مرتبہ اور ساہتیہ اکادمی، دہلی سے شائع شدہ یہ تفسیر چار جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں سورۃ النور کی ترجمانی وتشریح کا اضافہ ہے۔(۷)

رہا یہ مسئلہ کہ اصل منصوبہ کے مطابق مولانا آزاد ''البیان'' میں کس شرح وبسط کے ساتھ قرآن کی تفسیر لکھنا چاہتے تھے، پروفیسر ظفر صاحب مرحوم کے خیال میں یہ معلوم کرنے کے لیے ''ترجمان القرآن'' کی جلد اول میں سورۃ الفاتحہ کا مطالعہ کافی ہوگا جسے مولانا آزاد نے ''تفسیر سورہ فاتحہ'' کا نام دیا ہے۔ اہم بات یہ کہ مرحوم نے اسی سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ مفسر گرامی کی نظر میں تفسیر اور ترجمانی کے حدود ودائرے الگ الگ ہیں۔ ''ترجمان القرآن'' کی موجودہ صورت میں انہوں نے درحقیقت تفسیر صرف سورۂ فاتحہ کی لکھی ہے، باقی سورتوں کے ضمن میں انہوں نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ اصلاً ''قرآن پاک کی ترجمانی'' کے ذیل میں آتا ہے۔(۸)

''ترجمان القرآن'' کے امتیازات اور مولف محترم کے مخصوص منہج اور مجتہدانہ انداز کے بارے میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم کا جامع تبصرہ یہ ہے ''انہوں نے برسوں قرآن پاک کا مطالعہ کیا، سیکڑوں سوالات اٹھائے اور پھر ان کے حل تلاش کیے ہیں۔ بہت سے نئے نکتوں کی جانب پہلی بار متوجہ کیا ہے۔ متعدد پرانے اشکالات کے نئے جواب دیے ہیں۔ اکثر مقامات پر رک گئے ہیں، جہاں دوسرے مفسرین سرسری گذر گئے ہیں اور جہاں قدیم مفسرین لمبی لمبی بحثیں کرتے ہیں، وہ اپنی بات دو چار جملوں میں کہہ کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس لیے بحیثیت مجموعی ''ترجمان القرآن'' اردو وعربی کی دوسری تفسیروں سے الگ معلوم ہوتی ہے''(۹)۔ خاص بات یہ کہ صاحب مقالہ نے ''ترجمان القرآن'' کی صرف خصوصیات بیان کرنے پر اکتفاء نہیں کیا ہے، بلکہ ہر خصوصیت کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا آزاد کے اس پُرزور بیان (کہ قرآن پاک اپنے طریق استدلال، طرز خطاب اور انداز بیان کے لحاظ سے سادہ وعام فہم ہے اور منطق وفلسفہ کے پیچ در پیچ مقدمات سے پاک ہے)

انہوں نے سورۃ الانبیاء کی آیت/ ۹۳ (انَّ ھذہ امّتکم امّۃ واحدۃً وانا ربّکم فاعبدون) کے ذیل میں مولانا آزاد کا یہ تشریحی نوٹ نقل کیا ہے ''آیت/ ۹۳ اس تمام تذکرے کا خلاصہ ہے جو انبیائے کرام کا اوپر گذر چکا ہے، یعنی اللہ کے یہ تمام رسول جو مختلف عہدوں اور قوموں میں ظاہر ہوئے، ان سب کی دعوت کا ماحصل کیا تھا؟ انہوں نے نسل انسانی مختلف عہدوں اور گروہوں کو کس بات کا پیام پہنچایا؟ وہ بات ایک یا ایک سے زائد؟ یہ آیت اپنے نپے تلے لفظوں میں جواب دیتی ہے کہ ان سب کا پیام ایک ہی تھا۔ سبحان اللہ قرآن کی معجزانہ بلاغت، ایک چھوٹی سے آیت کے اندر اس معاملہ کے سارے دفتر کس طرح سمیٹ دیے ہیں اور پھر صرف امر وخبر ہی نہیں، بلکہ ترتیب بیان نے خود بخود استدلال کی روشنی پیدا کردی ہے۔ ایک ہی آیت میں تینوں توحیدوں کا بیان جمع کر دیا۔ توحید امت، توحید ربوبیت، توحید دین وعبادت اور یہی تین توحیدیں دعوت قرآنی کا اصل اصول ہیں۔ وہ ہر جگہ انہی کی صدا بلند کرتا ہے اور انہی پر اپنی تعلیم وتذکیر کی ساری بنیادیں استوار کرتا ہے''۔ (۱۰)

مزید برآں محترم ظفر صاحب نے ایک محقق مفسر کی حیثیت سے مولانا آزاد کا ایک امتیاز اس طور پر اجاگر کیا ہے کہ انہوں نے اپنے دور کے علوم جدیدہ (تاریخ، جغرافیہ وعلم الآثار وغیرہ) اور نئی تحقیقات سے بالخصوص قرآنی الفاظ واشخاص کے معنی ومفہوم متعین کرنے میں بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے قرآنی شخصیات سے متعلق مولانا آزاد کی تحقیقی کاوش کی ایک مثال یہ دی ہے کہ قرآن میں ''اصحاب کہف'' کے لیے کہف کے علاوہ ''رقیم'' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ بیشتر مفسرین نے ''رقیم'' کو رقم (بمعنی کتابت) سے ماخوذ مانتے ہوئے اصحاب رقیم سے کتبہ بنانے والے مراد لیا ہے، جبکہ صاحب ''ترجمان القرآن'' کی رائے میں ''رقیم'' ایک شہر کا نام ہے، جیسا کہ اس لفظ کی تشریح میں انہوں نے یہ واضح کیا ''اکثر مفسر اس طرف چلے گئے کہ یہاں رقیم کے معنی کتابت کے ہیں، یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگا دیا گیا تھا، اس لیے یہ کتبہ والے مشہور ہو گئے۔ لیکن انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ ''رقیم'' وہی لفظ ہے جسے تورات میں ''راقیم'' کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر ''پیڑا'' کے نام سے مشہور ہوا اور عرب اسے ''البتراء'' کہنے لگے۔ عالم گیر جنگ کے بعد کے آثار قدیمہ کی تحقیقات سے جو نئے نئے گوشے کھلے ہیں، ان میں سے ایک پیڑا بھی ہے اور اس کے انکشافات نے بحث ونظر کا ایک نیا میدان مہیّا کر دیا ہے (۱۱)۔ اسی

طرح پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم نے قرآنی شخصیات میں ذوالقرنین کے بارے میں (تقریباً ۳۵ صفحات پر مشتمل) مولانا آزاد کی تحقیقات اور تاریخ، جغرافیہ اور آثار قدیمہ کی مدد سے اس کے مصداق کی تعیین کی قدر و قیمت واضح کی ہے اور مزید یہ کہ اسی ضمن میں ان کی تحقیقات سے متعلق بعض ممتاز علمائے دین و ماہرین قرآنیات (بالخصوص مولانا سید ابوالحسن ندویؒ و مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ) کی قیمتی آراء بھی نقل کی ہیں۔(۱۲)

ان سب کے علاوہ ''ترجمان القرآن'' کے حوالے سے قرآنی آیات کی تشریح و توضیح میں علومِ جدیدہ سے استفادہ سے متعلق اس مبسوط و مدلل بحث کے آخر میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی یہ وضاحت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے ''مولانا آزاد مطالب قرآنیہ کی تفسیر و توضیح کے سلسلہ میں ان علوم سے استفادہ کے قائل ضرور ہیں، لیکن ان کے نزدیک صحت و صداقت کا معیار نصوص قرآن ہیں نہ کہ ان علوم کے حقائق و مسلمات۔ مثلاً اگر کہیں قرآنی بیانات کی تصدیق تاریخ اور علم الآثار وغیرہ سے نہیں ہوتی تو وہ ایسی صورت حال کو انسانی علوم کی کوتاہی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اس پر قرآنی صداقت کو قربان نہیں کرتے'' (۱۳)۔ اس سلسلہ میں مزید اہم بات یہ کہ مرحوم نے ''ترجمان القرآن'' سے اس کی کئی مثالیں پیش کیں اور یہ بھی واضح کیا کہ صاحب ترجمان القرآن جدید دور کی ان تفاسیر سے اتفاق نہیں کرتے جو یورپ کی تحقیقایت جدیدہ سے متاثر ہو کر لکھی گئیں اور جن میں جدید تحقیقات کو معیار بنا کر قرآنی آیات کو ان پر منطبق کرنے کی کوشش کی گئی، انہوں نے اپنی تفسیر کی جلد اول میں ان کے مولفین پر سخت تنقید بھی کی ہے۔(۱۴)

مولانا آزاد نے قرآن کریم کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کو ''ترجمان القرآن'' میں جا بجا بڑی خوش اسلوبی سے اجاگر کیا ہے۔ پروفیسر ظفر صاحب نے اس پہلو سے بھی ''ترجمان القرآن'' کا جائزہ لیا ہے اور اس کی مثالیں دیتے ہوئے اس باب میں بھی مولانا آزاد کے انداز کو مجتہدانہ قرار دیا ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیات ۸۳۔۸۴ (وایوب اذ نادیٰ ربہ انی مسنی الضرُّ وانت ارحم الراحمین اور (یاد کرو) جب (حضرت) ایوب نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے بیماری لاحق ہو گئی ہے اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے) کی تفسیر میں مولانا آزاد نے جس دلکش و موثر انداز میں قرآنی بلاغت کو نمایاں کیا ہے اسے مرحوم نے انہی کے الفاظ میں اس طور پر نقل کیا ہے:

"قرآن نے صبر و شکر کی یہ پوری داستان یہاں صرف چند جملوں میں بیان کردی ہے اور اس کا ایجاز بلاغت اتنا ہی موثر ہے جتنا صحیفۂ ایوب کے پچاس صفحوں کا شاعرانہ اطناب ہے۔"انّی مسّنی الضر" میں ان کی درد و مصیبت کی ساری داستان آ گئی۔کوئی گوشہ بھی نہیں چھوٹا۔ساتھ ہی اسلوب خطاب یہ ہوا کہ میں دکھ میں پڑ گیا ہوں۔ یہ نہ ہوا کہ تو نے مجھے دکھ میں ڈال دیا ہے، کیونکہ وہ تو کسی کو بھی دکھ میں نہیں ڈالتا۔اس نے جو کچھ بھی بخشا ہے سرتا سر راحت ہی راحت ہے۔ جو حالت بھی ہمارے لیے دکھ ہوجاتی ہے، خود ہماری ہی صورت حال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام کے مخاطبات میں ہر جگہ یہی حقیقت نمایاں ہوتی ہے۔اس کے بعد کہا" وانت ارحم الرحمین" اور غور کرو اس ایک جملہ میں سفر ایوب کے کتنے صحیفے آ گئے۔اس میں حمد وثنا بھی آ گئی، صبر و شکر کا دامن بھی نہیں چھوٹا۔ طلب والحاح کا ہاتھ بھی دراز ہو گیا اور عجز و نیاز کی پیشانی بھی بندگی اور تذلل کی زمین پر پڑ گئی۔خدایا میں دکھی ہوں اور تجھ سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو؟ "طوبی لعبد تکون مولاہ"۔اگر ایک فقیر بادشاہ سے کہے کہ "میں محتاج ہوں اور تجھ سے بڑھ کر کوئی سخی نہیں" تو پھر اس کے بعد کیا رہ گیا جو اس نے نہیں کہا اور کیوں اس سے زیادہ اس کی زبان سے کچھ نکلے؟ بلاشبہ یہ عرض حال ہے، طلب و سوال نہیں، لیکن

در حضرت کریم تقاضا چہ حاجت است؟

اس کے بعد صرف ایک آیت کے اندر پوری سرگزشت اور اس کا ماحصل بیان کردیا۔غور کرو کس طرح یہ آیت ایک پورے صحیفے کا کام دے رہی ہے اور کس طرح اس کا ہر جملہ اپنی جگہ ایک پورا باب ہے"۔(۱۵)

پروفیسر ظفر صاحب مرحوم کے مطالعہ "ترجمان القرآن" کا یہ پہلو بھی لائق تحسین ہے کہ اس تفسیر کے امتیازات اور اس کے مباحث کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ اس میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ تفسیر بعض پہلوؤں سے متنازع فیہ رہی ہے اور بعض علماء نے اس پر سخت نقد کیا ہے۔ناقدین

میں مولانا یوسف بنوریؒ بھی شامل ہیں جنھوں نے اپنی عربی کتاب ''یتیمة البیان'' میں اس پر سخت تنقید کی ہے۔

مرحوم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ مولانا آزاد نے متعدد آیات کی تفسیر میں جمہور علماء کے موقف سے اختلاف کیا ہے اور اہم بات یہ کہ فاضل مقالہ نگار نے ان مباحث کی نشاندہی بھی کی ہے جن میں ''ترجمان القرآن'' کی توضیحات جمہور علماء/مفسرین کے نقطۂ نظر کے برخلاف ہیں، مثلاً اصحاب کہف کا کئی برس تک غار میں سوئے رہنا، سامری کے بچھڑے کی کیفیت، حضرت سلیمانؑ کے حق میں ہواؤں اور شیاطین کا مسخر ہونا، حضرت داؤدؑ کے لیے پرندوں کی تسخیر، یوم سبت کی بے حرمتی کے نتیجہ میں بنی اسرائیل کا بندر بن جانا۔(۱۶)

مرحوم کے مقالات کے دوسرے مجموعہ ''تحقیقی مقالات'' (مطبوعہ خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ) میں ایک باب ''واقدی۔ احوال و علمی آثار'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مقالہ بھی اعلیٰ تحقیقی معیار اور علمی انداز بیان کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ واقدی کے حالات زندگی کے بیان میں صاحب مقالہ کی تحقیقی کاوشوں اور ان کی مدلل بحث کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کے اصل نام اور ان نسبت کی بابت مورخین کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے خود ان کی کتاب (کتاب المغازی) کے حوالے سے انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ متعدد مقام پر واقدی نے اپنا تعارف ''ابن واقد'' سے کرایا ہے اور پھر ان کی دیگر نسبتوں (مدنی، اسلمی، سہمی) کے وجوہ بیان کیے ہیں۔ ان کے اساتذہ و شیوخ کے ذکر میں خاص اساتذہ کے نام مآخذ کے حوالے سے تحریر کیے ہیں۔ اساتذہ سے کسب فیض میں اسے واقدی کا امتیاز قرار دیا ہے کہ وہ صرف سماع و قراءت پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، بلکہ سوالات بھی کرتے اور استفسارات کے ذریعہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتے اور اہل علم کی مجالس اور عام اشخاص سے ملاقات کے دوران مفید مطلب باتیں دریافت کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کرتے تھے۔ ان کی علمی جستجو اور واقعاتی شہادت کی تلاش و جستجو کا عالم یہ تھا کہ وہ مشاہدہ کے لیے تاریخی مقامات کا سفر کرتے تھے، جیسا کہ خود انہوں نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے(۱۷)۔ واقدی کے بارے میں یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ بغداد کے قاضی رہے ہیں، لیکن کسی مآخذ میں یہ وضاحت نہیں ملتی کہ وہ کب اور کس خلیفہ کے عہد میں قاضی رہے ہیں۔ ابن حجر عسقلانی نے ان کے ایک شاگرد کے حوالے سے یہ بیان نقل کیا

ہے کہ علی ابن مدینی کی ان سے بغداد میں ملاقات ۱۸۷ھ یا ۱۸۸ھ میں ہوئی جب کہ واقدی وہاں قاضی کے عہدہ پر مامور تھے۔اسی بنیاد پر بعض مستشرقین نے یہ ذکر کیا کہ وہ ۱۸۷ھ میں خلیفہ ہارون کے زمانہ میں اس منصب پر فائز تھے۔مرحوم نے متعدد وجوہ سے اس بیان کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ ان میں ایک یہ ہے کہ ابن حجر نے صرف سال (سنۃ سبع او ثمان و ثمانین) تحریر کیا ہے،صدی کا ذکر نہیں ملتا۔دوسرے، راوی کا سنہ ولادت ۱۸۲ھ ہے،تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ۱۸۷ھ (یعنی محض پانچ برس کی عمر میں) بغداد کے شیوخ کی مجالس میں حاضری دیتے رہے ہوں (۱۸)۔مزید برآں انہوں نے یاقوت کے اس بیان کا حوالہ دیا ہے کہ ہارون نے واقدی کو بغداد کے مشرقی حصہ کا قاضی مقرر کیا تھا اور مامون نے انہیں "عسکر المہدی" کے قاضی کے منصب پر مامور کیا۔پروفیسر ظفر صاحب کے خیال میں یہ بیان واضح ہونے کے باوجود دو وجوہ سے ناقابل اعتبار ہے۔اول یہ کہ اس بیان کی کوئی سند مذکور نہیں ہے (۱۹)۔دوسرے اس میں بغداد کے مشرقی حصہ اور "عسکر المہدی" کو دو الگ الگ مقام کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے،جب کہ ابن خلکان کی تصریح (وفیات الاعیان، ۳/۳۵۱) کے مطابق موخر الذکر بغداد کے مشرقی حصہ کے ہی ایک محلہ کا نام ہے (۲۰)۔اسی طرح واقدی کے سن وفات سے متعلق مختلف روایتیں (۲۰۶ھ، ۲۰۷ھ، ۲۰۹ھ) ملتی ہیں۔محقق گرامی مرحوم نے ان سب کا ذکر ان کے ناقلین کے حوالے کے ساتھ کیا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ بیشتر تذکرہ نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ واقدی نے بروز شنبہ گیارہویں تاریخ کو بوقت شام وفات پائی (۲۱)۔مزید برآں انہوں نے واقدی کی اولاد اور ان کے اہل خاندان کے ذکر کے بعد ان کے علم و فضل پر روشنی ڈالی ہے اور محدث، فقیہ و مورخ کی حیثیت سے ان کا مقام مرتبہ واضح کیا ہے اور پھر مختلف موضوعات پر ان کی ۲۸ کتب کی فہرست ابن ندیم کی الفہرست کے حوالے سے پیش کی ہے۔آخر میں ان میں سے کچھ منتخب کتب کا تعارف بھی دیا ہے۔زیر بحث موضوع پر موصوف محترم کے مطالعہ کی قدر و قیمت (بالخصوص اس کے تحقیقی پایہ) کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ باب کے آخر میں اس پر حواشی و مراجع تقریباً پانچ صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں (۲۲)۔ان سب باتوں کے علاوہ اس پورے مضمون میں جو منطقی ربط پایا جاتا ہے،وہ اپنی جگہ لائق تحسین ہے۔اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ ان کی تقریر و تحریر میں جو ربط ملتا ہے اسے انہوں نے اپنے استاد گرامی (مولانا محمد یونس جون پوریؒ) کے درس کا فیض قرار دیا ہے۔

اسی مجموعہ مقالات کا ایک اور باب (علوم دینیہ اور مطبع نول کشور) (۲۳) زیر بحث موضوع کی اہمیت وافادیت، فراہم کردہ معلومات کی قدر و قیمت اور تحقیقی انداز بیان مختلف اعتبار سے لائق مطالعہ ہے۔ ۳۳ صفحات پر مشتمل اس مقالہ میں بانی مطبع منشی نول کشور (۳/جنوری ۱۹۳۶ء۔ ۹/فروری ۱۸۹۵ء) کے مختصر حالات اور مطبع کے قیام وانصرام کی مختصر تاریخ کے علاوہ مطبع سے متعلق یہ امور زیر بحث آئے ہیں: موضوع کے لحاظ سے کتابوں کی طباعت کا دائرہ کار، مطبع سے شائع شدہ کتب کے کچھ ممتاز مصنّفین کی فہرست، تفسیر، حدیث وفقہ پر عربی، فارسی واردو کی طباعت، دینی علوم کی عربی کتب کے فارسی واردو تراجم کی اشاعت، مطبع سے شائع شدہ علوم دینیہ کی نایاب کتابوں کا تعارف، طباعت سے قبل اہم کتابوں کے شروح وحواشی کی تیار کرانے کا اہتمام، مطبع سے مصحح، محشی و مترجم کی حیثیت سے وابستہ علماء کی فہرست (مع اسمائے کتب جن کی تصحیح، تحشیہ وترجمہ کا کام ان کے توسط سے انجام پایا) اور مطبع سے شائع شدہ تفسیر، حدیث وفقہ کی عربی، فارسی واردو کتب کی فہرست (مع دیگر ضروری معلومات)۔

پروفیسر ظفر احمد صاحب کے خیال میں مطبع نول کشور کے امتیازات یہ ہیں: مطبوعات کی کثرت، موضوع کے اعتبار سے ان کا تنوع، مطبوعات میں پانچ زبانوں (عربی، فارسی، اردو، ہندی و انگریزی) کی کتابوں کا شامل ہونا، صدر دفتر لکھنؤ کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں (کانپور، الہ آباد، آگرہ، دہلی، پٹیالہ اجمیر، لاہور) میں اس کی شاخوں کا قیام، مشرقی علوم کے ہر پہلو پر کتابوں کی اشاعت (۲۴)۔ دینی علوم کی نسبت سے مطبع کی خدمات کی قدرو قیمت پر فاضل مصنف کا یہ مختصر تبصرہ جامعیت سے بھرپور ہے: ''علمی وادبی کتابوں کے ساتھ بے شمار ایسی مذہبی کتابیں مطبع نول کشور نے شائع کردیں کہ اگر وہ نہ شائع ہوتیں تو شاید ہندوستان سے وہ ناپید ہوجاتیں''۔ (۲۵)

دینی علوم کی ترویج واشاعت میں مطبع نول کشور کی خدمات پر پروفیسر ظفر احمد صاحب کا یہ مطالعہ بلاشبہ بڑی قدرو قیمت وافادیت رکھتا ہے۔ ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء کو مطبع نول کشور کے قیام کا سن قرار دیتے ہوئے انھوں نے اس نکتہ کی جانب توجہ دلائی ہے کہ دورِ زوال میں علومِ دینیہ کے بقاو استحکام میں اصل کردار تو مدارس عربیہ کا رہا ہے، ان علوم کی اشاعت کے ''ثانوی عوامل کے درجہ میں مطبع نول کشور کا قیام ایک زبردست عامل کی حیثیت رکھتا ہے'' اور اسی ضمن میں اس مطبع کے سب سے

بڑے کارنامے کے طور پر یہ بھی ذکر کیا گیا کہ ”اس نے معاصر علماء و ارباب قلم کے دلوں میں تصنیف و تالیف کا ولولہ برقرار رکھا اور ہندوستانی مصنّفین کی صدہا تصانیف کو ضائع ہونے سے بچا لیا“ (۲۶)۔ یہاں یہ واضح رہے کہ اس مقالہ میں بانی مطبع کے حالات زندگی اور مطبع کے قیام و انصرام اور اس کی ترقی کی رفتار سے متعلق کچھ مفید معلومات حواشی میں فراہم کی گئی ہیں (۲۷)۔ انہیں مضمون کے شروع میں اصل متن میں دیا گیا ہوتا تو زیادہ بہتر و برمحل ہوتا۔

مطبع سے مختلف حیثیت سے وابستہ ۲۸ علماء کی جو فہرست اس مقالہ میں دی گئی ہے وہ اس لحاظ سے بہت مفید ہے کہ اس طرح کی کوئی فہرست کہیں یکجا یا مرتب نہیں ملتی۔ دوسرے، فہرست میں شامل علماء نے جن کتابوں کی تصحیح، تحشیہ یا ان کے ترجمہ کی خدمت انجام دی ان کی نشاندہی بھی کی گئی ہے (۲۸) ظاہر ہے کہ یہ فہرست تیار کرنے کے لیے مرحوم نے نہ معلوم کتنی کتابوں کی ورق گردانی کی ہوگی اور پھر ہر ایک کے ضمن میں ان کی تصحیح، تحشیہ یا ترجمہ کی کتابوں کا پتہ لگانا آسان نہیں، بلکہ بڑا دقت طلب کام تھا۔ یقیناً یہ تلاش و جستجو کا شوق تھا اور محنت و مشقت کی عادت تھی جس نے اسے آسان بنا دیا۔ ان سب کے باوجود یہ اعتراف بھی ہے کہ مزید تلاش و جستجو سے اس فہرست میں اور نام شامل ہو سکتے ہیں۔ اسی ضمن میں صاحبِ مقالہ نے مطبع نول کشور کی گراں قدر خدمت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے دورِ زوال میں معاشرہ کے مختلف طبقہ کے لوگ اقتصادی حالت کی خستگی کا شکار ہو گئے تھے، اس آزمائشی صورت حال میں مطبع نول کشور بہت سے اہل علم کے لیے بھی معاشی نقطۂ نظر سے سہارا ثابت ہوا۔ ان کا یہ احساس بجا ہے کہ مطبع نول کشور کی خدمت کا یہ پہلو ابھی تک پوری طرح اجاگر نہیں کیا سکا ہے، بہتر ہوگا کہ اہل قلم بالخصوص محققین اس کے لیے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو استعمال کریں۔ (۲۹)

پیش نظر مقالہ کا ایک اہم حصہ علوم دینیہ کے ان نایاب و نادر مخطوطات کے تعارف اور ان کی قدر و قیمت کی وضاحت سے تعلق رکھتا ہے جو مطبع نول کشور کے زیر اہتمام شائع ہوئے تھے۔ ان میں خاص قابل ذکر یہ ہیں: عہد اکبری کی مشہور غیر منقوط تفسیر ”سواطع الالہام“ (مولفہ ابوالفیض فیضی)، ”تفسیر سراج المنیر“ (مصنفہ محمد الشربینی الخطیب)، تبیان فی اعراب القرآن (مصنفہ عبداللہ ابن حسین العکبری)، صحیح بخاری کی ایک معروف شرح ”ارشاد الساری“ (مولفہ احمد ابن محمد ابن ابی بکر

القسطلانی) فقہ حنفی کی مشہور کتاب ھدایہ کی شرح ''البنایۃ فی شرح الھدایۃ'' (مولفہ علامہ بدرالدین عینی) اوراسی کتاب کی دوسری شرح ''فتح القدیر'' (مولفہ کمال الدین ابن ہمام)۔ مذکورہ بالا کتب میں ''سواطع الالہام'' کی طباعت سے متعلق ممتاز اسکالر پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے اپنے مقالہ (مطبع نول کشور اور قرآن کریم کی اشاعت) میں ایک بڑی قیمتی اطلاع فراہم کی ہے، یہاں اس کا ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا اور وہ یہ کہ ''منشی نول کشور نے اسے شائع کرنے سے پہلے ندوۃ العلماء کے ممتاز عالم اور پرنسپل مولانا امیر علی ملیح آبادی سے اس پر مقدمہ لکھوایا اور انہوں نے بھی پورا مقدمہ بے نُقط رقم کیا'' (۳۰)۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دینی علوم کے قدیم متون کی اشاعت سے قبل علم دوست مالک مطبع اس پر کسی معروف عالم دین سے مقدمہ لکھوانے کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ مزید برآں اس مطبع سے جو کتابیں قدیم یا معاصر علماء کے حواشی سے مزین کرکے شائع کی گئی تھیں، پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم نے ان کی نشاندہی بھی کی ہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں: جلالین، بیضاوی، صحیح مسلم، تقریب التہذیب، ہدایہ، شرح وقایہ، مختصر وقایہ، کنز الدقائق، قدوری، البنایہ شرح ہدایہ، الکفایہ شرح ہدایہ، اصول الشاشی، نورالانوار، حسامی، التوضیح والتلویح۔ (۳۱)

مقالہ کا آخری حصہ تفسیر، حدیث وفقہ پر مطبع نول کشور کے زیر اہتمام شائع شدہ عربی، فارسی واردو کتابوں کی ایک طویل فہرست پر مشتمل ہے، یہ بڑی اہمیت وافادیت کا حامل ہے۔ دینی علوم پر مطبوعہ کتابوں کی یہ فہرست بہت ہی معلوماتی ولائق استفادہ ہے، اس کے لیے فاضل مقالہ نگار بلاشبہہ علوم اسلامیہ کے طلبہ و محققین کی جانب سے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ تفسیر، حدیث وفقہ میں سے ہر موضوع پر تینوں زبانوں کی کتابوں کی فہرست الگ الگ الفبائی ترتیب کے مطابق مندرج کی گئی ہے۔ اس ضمن میں مزید اہم بات یہ کہ کتابوں کے عناوین کے ساتھ ان کے مصنّفین/ مولفین/ مترجمین کے نام، سن طباعت اور صفحات کی تعداد الگ الگ کالم میں درج کیے گئے ہیں اور اس فہرست میں مندرج بہت سی کتابوں کی نوعیت/ خصوصیت بھی واضح کی گئی ہے۔ (غالباً دینی علوم پر مطبوعہ کتب کی تعداد کی رعایت میں کتب فقہ کی فہرست زیر مطالعہ مقالہ میں سب سے پہلے مندرج ہے، جب کہ ظاہر ہے کہ تفسیری کتب کی فہرست اولیت کی مستحق تھی)۔

علوم دینیہ پر مطبع نول کشور کی مطبوعات کی فہرست پیش کرتے ہوئے مصنف گرامی نے یہ

خیال ظاہر کیا ہے کہ مختلف علوم وفنون پر مطبع نول کشور کی ایک جامع ومکمل فہرست مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔اگر یہ اہم کام انجام پا جائے تو اہل علم واصحاب تحقیق کے لیے یہ ایک بیش بہا تحفہ،حوالہ کے لیے ایک گراں مرجع اور بانی مطبع کی خدمات کے اعتراف کی ایک بہتر صورت ہوگی۔اس مفید تجویز کے آخر میں مرحوم نے یہ مصرعہ نقل کر کے اپنے پیغام کی لَے بڑھادی ہے:''صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے'' (۳۲)۔اللہ کرے کسی خادم علم کو اس کی توفیق نصیب ہو جائے اور ایک مفید علمی خدمت انجام پا جائے۔

بہرحال مصنف گرامی مرحوم نے پیش نظر مقالہ کو مختلف اعتبار سے مفید بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔واقعہ یہ کہ اسلام کے اساسی علوم (تفسیر،حدیث وفقہ) پر نول کشور کی مطبوعات کی یکجا مرتب فہرست شاید ہی کسی اور کتاب یا مقالہ میں ملے،اس لحاظ سے مذکورہ بالا فہرست کی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں محسوس ہوتا کہ مفید معلومات سے بھرپور یہ مقالہ بھی مصنف گرامی کے مطالعہ کی وسعت و گہرائی،علمی کاموں میں سنجیدگی وانہماک اور علم کی خدمت میں گہری دلچسپی کی شہادت دے رہا ہے۔

واقعہ یہ کہ مذکورہ بالا زیر مطالعہ تصانیف کے علاوہ پروفیسر ظفر صاحب مرحوم کی دیگر کتابوں یا ان کے مقالات ومضامین کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو ان کی نگارشات میں زبان وبیان کے محاسن،مدلل انداز بحث،کسی شخصیت یا کسی کتاب کے مطالعہ میں مختلف پہلوؤں سے جائزہ،مشتملات کا تنقیدی تجزیہ،پورے مضمون یا باب میں منطقی ربط وارتباط اور مآخذ ومراجع کا حوالہ دینے کا اہتمام جیسی ظاہری ومعنوی خوبیوں کی مثالیں مل جائیں گی اور ان کا علمی انداز وتحقیقی منہج مزید اجاگر ہو جائے گا۔معارف کے مرتب گرامی مولانا محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی نے ''وفیات'' کے تحت مرحوم پر اپنی تحریر میں ان کی معروف تصنیف ''نظم طباطبائی۔شرح دیوان اردوئے غالب'' کے حوالے سے پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے اعلیٰ تحقیقی ذوق اور جدید دور کے محققین میں ان کے مقام ومرتبہ پر ان الفاظ میں اپنا تاثر ظاہر کیا ہے:

> ''(دیوان) غالب کی اس مکمل شرح کی انہوں نے جس طرح تجدید وتزئین اور قریب ساڑھے سات سو صفحات میں اپنی ژرف نگاہی اور دیدہ ریزی کے نقوش

ثبت کیے اس سے وہ اردو کے نئی نسل کے معتبر ترین محققوں بلکہ ناقدوں کی صف اول میں بڑی شان سے جگہ پا گئے"۔(۳۳)

علم و فضل کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے علاوہ پروفیسر ظفر احمد صدیقی ذاتی زندگی میں بھی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔فرائض منصبی کی ادائیگی میں وہ بہت سنجیدہ تھے اور اس باب میں وہ بڑی ذمہ داری کا ثبوت دیتے تھے،جیسا کہ ان کے رفقائے شعبہ اور تلامذہ اور ریسرچ اسکالرس کے تاثرات و بیانات سے اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ان کے رفیق شعبہ پروفیسر امتیاز احمد نے اپنے مضمون میں خود اپنے تاثرات پیش کرنے کے علاوہ مرحوم کے بعض شاگردوں کے بیانات بھی نقل کیے ہیں۔ایک استاد کی حیثیت سے پروفیسر ظفر احمد مرحوم صاحب کے فضائل پر روشنی ڈالتے ہوئے فاضل مضمون نگار تحریر کرتے ہیں"ایک استاد کی حیثیت سے وہ اپنے شاگردوں کے لیے بہترین نمونہ تھے۔ہر وقت ان کے کام آتے اور ان کی بہترین تعلیم و تربیت پر اپنی اعلیٰ صلاحیتیں صرف کرتے تھے۔ان کی ان محبتوں اور عنایتوں کا ان کے شاگردوں نے بکثرت ذکر کیا ہے۔مثال کے طور پر ان کے ایک شاگرد عبدالرزاق صاحب کا تاثر ہے"پروفیسر ظفر احمد صدیقی ایک اچھے اور مشفق استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین انسان بھی تھے۔وہ اپنی ذاتی معاملات کا ہم لوگوں سے کوئی ذکر نہیں کرتے تھے، البتہ ہم لوگوں کی خیر خیریت مستقل دریافت کرتے رہتے تھے۔فجر کے بعد،ظہر کے بعد،رات کے گیارہ بجے کسی بھی وقت ان سے فون پر گفتگو کی جاسکتی تھی،یہاں تک کہ گھر آنے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی،بس یہ ہدایت تھی کہ آنے سے پہلے فون کرلیں تاکہ ہم گھر پر موجود ہیں یا نہیں،یہ معلوم ہوسکے"(۳۴)۔وہ اپنے ریسرچ اسکالرس کے کاموں کو کس پابندی وانہماک سے دیکھتے تھے،اس بارے میں ڈاکٹر عقیل احمد کا بیان ملاحظہ فرمائیں"مجھے کام کرنے کے دوران ان کی کتب بینی اور استحضار علم کا اندازہ ہوا۔اس لیے مجھے کام کرنے میں آسانی ہوئی۔وہ ہر دو تین دن کے بعد کام چیک کرتے تھے،حرف حرف پڑھتے تھے۔کچھ کمی ہوتی تو اس کی نشان دہی کرتے۔مزید متعلقہ مواد کہاں،کس کتاب،کس رسالہ میں ہے اس کی نشان دہی فرمادیتے۔بعض اوقات چیک کرنے کے بعد کہتے"آپ نے ٹھیک لکھا ہے،اسے رکھ لیجیے،لیکن اب اسے اس طرح کرلیجیے اور اس سے متعلق وضاحتی گفتگو کرتے جس سے نکات اسی وقت نوٹ کرلیتے،بعدہ اس کی تفصیل لکھتے"۔(۳۵)

ان سب کے علاوہ پروفیسر ظفر صاحب گھر والوں اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی میں بھی سرگرم رہتے تھے، جیسا کہ ان کے اہل خانہ اور قریبی اعزہ کے بیانات سے واضح ہوتا ہے۔ بقول ان کی چچازاد بہن محترمہ ''ظفر بھیّا کے والد یعنی میرے تایا مولانا وقار احمد تین بھائی تھے، سب سے بڑے وہ خود، پھر مولوی اظہار احمد اور مولانا عمار احمد۔ چونکہ تینوں بھائیوں کی اولاد میں ظفر بھیّا سب سے بڑے تھے، اس لیے ہم سب تایا زاد بھائی بہن ان کو بڑے بھیّا ہی کہتے تھے اور وہ ہمیشہ بڑے بھائی ہونے کا فرض بھی نبھاتے تھے، ہم سب ان کا بہت احترام کرتے تھے''(۳۶)۔ اخلاق حسنہ کے باب میں بھی وہ اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ ان کے اوصاف محمودہ میں دین داری و پرہیز گاری، سادگی وانکساری، تصنع سے دوری، خوش خلقی و ملنساری کا ذکر ان کے رفقاء واحباء اور اساتذہ و تلامذہ سبھی کرتے رہتے ہیں۔ محترم المقام مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب نے مرحوم پر اپنے مضمون میں ان کے علمی کاموں کی قدر و قیمت واضح کرتے ہوئے آخر میں یہ تحریر فرمایا ہے ''اس کے ساتھ ان کے اندر سعادت مندی، صلاح اور دوسری خوبیاں بھی تھیں جو لوگوں میں اب ناپید ہوتی جارہی ہیں''(۳۷)۔ مولانائے محترم کے اس بیان کی اہمیت اس پس منظر میں اور بڑھ جاتی ہے کہ مرحوم کو ندوۃ العلماء میں عربی ادب میں تخصص کرتے ہوئے ان سے تلمذ کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کے کردار و اخلاق کے باب میں ان کے رفیق شعبہ (پروفیسر امتیاز احمد صاحب) کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں:

> ''تقویٰ اور پرہیز گاری کی وجہ سے حافظہ کی مضبوطی، کردار کی پختگی اور علم کا جیسا استحضار پیدا ہوتا ہے ظفر صاحب کی شخصیت اس کا بہترین نمونہ تھی، وہ Simple Living پر یقین رکھتے تھے۔ ان کے یہاں کوئی پوز، کوئی دکھاوا یا show off نہیں تھا، اردو کے بڑے بڑے علماء ان سے استفادہ کرتے تھے اور اس استفادے کا برملا اعتراف کرتے تھے، لیکن انہوں نے کبھی اپنی کلاہ کج نہیں کی، کبھی اس پر نازاں نہیں ہوئے''۔(۳۸)

ان سب کے علاوہ اسی ضمن میں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ دینی مدارس سے کسب فیض کے دوران عام رہن سہن، ظاہری ہیئت، وضع قطع، لباس و پوشاک، طرز کلام میں ان اداروں کی تعلیم و تربیت کا جو پختہ رنگ مرحوم کی روزمرہ زندگی پر چڑھا، جدید جامعات سے بحیثیت متعلم و معلم

وابستہ ہونے کے بعد بھی اس رنگ کی پختگی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مولانا محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی کا یہ تاثر بالکل صحیح ہے کہ:

"وہاں (دینی اداروں میں) تعلیم کے ساتھ جس عالمانہ وضع قطع کے (وہ) عادی ہوئے، بنارس و علی گڑھ کی آب و ہوا بھی اس عادت پر اثر انداز نہیں ہوئی"۔ (۳۹)

مرحوم کی ذاتی زندگی کے ایک اور قابل قدر پہلو (جو ناچیز کے مشاہدہ پر مبنی ہے اور سبق آموز ہے) کی طرف اشارہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے جماعت کے ساتھ مسجد میں نماز کی ادائیگی کی پابندی۔ فرض عبادات میں نماز کو جو اہمیت و افضلیت حاصل ہے وہ محتاج وضاحت نہیں۔ اس فریضہ کی ادائیگی کو ایمان کا تقاضا یا اس کا اولین عملی مظہر کہا گیا ہے، اسے اللہ رب العزت سے تعلق کی مضبوطی کا سب بڑا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور مومن کی معراج سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی کی سخت تاکید کی گئی ہے اور موجب اجر کثیر بتایا گیا ہے۔ جدید دور میں ظاہری طور پر انسان کی مصروف زندگی میں کوئی صاحب ایمان مسجد میں وقت پر جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی کا پابند ہو جائے تو اسے واقعی مجاہدہ کہا جا سکتا ہے۔ ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم اس مجاہدہ کے عادی تھے۔ ہمارے محلّے (اقرأ کالونی) کی مسجد میں عشاء کی نماز کافی تاخیر سے ہوتی ہے۔ اپنے محلہ کی مسجد میں ان کی نماز عشاء کی جماعت چھوٹ جاتی یا کسی وجہ سے نماز میں تاخیر ہو جاتی تو وہ اقرأ کالونی کی مسجد میں نماز ادا کرتے تھے، اس موقع پر وقتاً فوقتاً مسجد میں داخل ہوتے یا نکلتے وقت ان سے ملاقات ہو جاتی تو علیک سلیک کے بعد میں ان سے کہتا تھا کہ یہ ہمارے محلہ کی مسجد کے لیے باعث اعزاز ہے کہ لوگ دور دور سے اس میں نماز کے لیے آتے ہیں، وہ جواب میں کہتے کہ یہ تو اس مسجد کا فیض ہے کہ ہمیں دوسری جگہ عشاء کی باجماعت نماز فوت ہو جانے پر یہاں نصیب ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ کہ دار فانی سے رخصت ہونے والے کی خوبیاں اور صفات محمودہ ہیں جو لوگوں کے دلوں میں گھر بنا لیتی ہیں اور اس کی نیکیاں و نیک خدمات ہیں جو ذخیرۂ آخرت بن جاتی ہیں۔ اللہ رب العزت ہم سب کو اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

مرحوم سے ناچیز کی آخری تفصیلی ملاقات کے دوران کی باتوں میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شعبۂ فارسی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے سابق استاد اور میرے دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر محمد خالد صدیقی

صاحب کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہیں کسی کی کوئی مطبوعہ تحریر پسند آتی ہے تو اس کی کاپی سیکڑوں کی تعداد میں زیراکس کرا کے بڑے اہتمام سے رسالہ کی صورت میں اسٹیپل کرا کے قدردانوں کو ہدیہ کرتے رہتے ہیں اور ناچیز کا ایک مضمون ''موت کی یاد'' (شائع شدہ ترجمان القرآن) بھی ان کی اس نیک خدمت کا مستحق بن چکا ہے۔ مرحوم نے بتایا کہ انہوں نے مجھے بھی اس مضمون کی کاپی بھجوائی تھی اور میں اسے پڑھ چکا ہوں۔ واقعہ یہ کہ مذکورہ بالا ملاقات کے وقت اس عاجز کو یہ شان و گمان بھی نہ تھا کہ مرحوم سے یہی ملاقات آخری تفصیلی ملاقات بن جائے گی۔ اس کے بعد بھی متعدد بار ان سے ملاقات ہوئی، لیکن آتے جاتے جاتے کہیں راستہ میں، کسی کی نماز جنازہ و تدفین میں شرکت کے دوران یا اقرا کالونی کی مسجد میں کبھی نماز کی ادائیگی کے وقت۔ قرآن کریم میں بار بار اس حقیقت کی یاددہانی کرائی گئی ہے کہ دنیا کی ہر چیز فانی ہے سوائے ذات رب العالمین کے۔ اس موقع پر سورۃ الرحمان کی آیت ۲۶ کی منظوم ترجمانی یاد آ گئی:

ذاتِ معبود جاودانی ہے باقی جو کچھ ہے وہ فانی ہے

اور اسی کے ساتھ متعدد آیات میں انسان کو یہ نکتہ بھی گوش گذار کیا گیا ہے کہ ہر شخص کی دار فانی سے رخصتی کا جو وقت مقرر ہے اس میں نہ ایک لمحہ کی تاخیر ہوگی اور نہ تقدیم۔ ارشادِ الٰہی ہے:

لن یؤخر اللہ نفساً اذا جاء اجلھا و اللہ خبیر بما تعملون (المنافقون: ۱۱/۶۳)	جب کسی (کی موت) کا وقت مقررہ آ جاتا ہے تو اللہ ہرگز اس میں (ایک لمحہ بھی) تاخیر نہیں کرتا اور اللہ باخبر ہے اس سے جو کچھ تم لوگ کرتے رہتے ہو۔

اللہ رب العزت پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب کو غریقِ رحمت کرے، انہیں ابدی سکون و آرام عنایت فرمائے اور ہمیں ان کی دینی و علمی خدمات سے سبق لینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ رب اغفر و ارحم و انت خیر الراحمین۔ آمین ثم آمین۔

حواشی و مراجع

(۱) روزنامہ انقلاب (علی گڑھ ایڈیشن)، مورخہ: ۳۱/ دسمبر۔ (۲) ظفر احمد صدیقی، مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار،

بھارت آفسیٹ، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۲۔ (۳) اہلیہ ڈاکٹر انوار احمد صدیقی، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی مرحوم۔ دنیائے تحقیق وادب کی قابل فخر شخصیت، تعمیر حیات، لکھنؤ، ۱۰ر فروری ۲۰۲۱ء، ص ۳۱۔ (۴) ظفر احمد صدیقی، مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار (''یہ کتاب'' / ابتدائی کلمات) محولہ بالا، ص ۳، ۱۲۔ (۵) افکار وشخصیات (عہد سرسید سے عصر حاضر تک)، رام پور رضا لائبریری، رام پور، ۲۰۰۶ء، (مقدمہ) ص ۱۵۔ ۱۶۔ (۶) ظفر احمد صدیقی، تحقیقی مقالات، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰، (منظور ہے گذارش احوال واقعی)۔ (۷) افکار وشخصیات محولہ بالا، ص ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ (۸) حوالۂ مذکور، محولہ بالا، ص ۱۱۶۔ (۹) حوالۂ مذکور، ص ۱۱۷۔ (۱۰) حوالۂ مذکور، ص ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ (۱۱) افکار وشخصیات، ص ۱۲۵۔ ۱۲۶ (بحوالہ ترجمان القرآن، لاہور ایڈیشن، ۲/ ۳۹۳)۔ (۱۲) حوالۂ مذکور، ص ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ (۱۳) حوالۂ مذکور، ص ۱۳۰۔ (۱۴) حوالۂ مذکور، ص ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ (۱۵) حوالۂ مذکور، ص ۱۳۳۔ ۱۳۴، بحوالہ ترجمان القرآن، محولہ بالا، ۲/ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ (۱۶) حوالۂ مذکور، ص ۱۳۵۔ ۱۳۸۔ (۱۷) تحقیقی مقالات، محولہ بالا، ص ۱۔ ۵۔ (۱۸) تحقیقی مقالات، ص ۸۔ (۱۹) معجم الادباء، ۷/ ۵۶۔ (۲۰) تحقیقی مقالات، ص ۷۔ (۲۱) ایضاً، ص ۱۲۔ ۱۳۔ (۲۲) ایضاً، ص ۲۵۔ ۳۰۔ (۲۳) یہ مضمون پہلے ماہنامہ الرشاد، اعظم گڑھ، میں بالاقساط (اگست وستمبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۷۔ ۳۴، ۱۶۔ ۴۳ بالترتیب) شائع ہوا تھا۔ (۲۴) تحقیقی مقالات، ص ۲۱۴۔ ۲۱۶۔ (۲۵) ایضاً، ص ۲۱۴۔ (۲۶) حوالۂ مذکور، ص ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ (۲۷) حوالۂ مذکور، ص ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ (۲۸) حوالۂ مذکور، ص ۲۲۰۔ ۲۲۲۔ (۲۹) حوالۂ مذکور، ص ۲۲۰۔ (۳۰) محمد سعود عالم قاسمی، مطبع نول کشور اور قرآن کریم کی اشاعت، ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، ۱۷/ ۲، جولائی۔ دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۵۔ (۳۱) تحقیقی مقالات، محولہ بالا، ص ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ (۳۲) حوالۂ مذکور، ص ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ (۳۳) معارف، وفیات، ۲۰۷/ ۲، فروری ۲۰۲۱ء، ص ۱۵۲۔ (۳۴) ڈاکٹر امتیاز احمد، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، تہذیب الاخلاق، ۴۰/ ۳، مارچ ۲۰۲۱ء، ص ۴۲۔ (۳۵) ڈاکٹر امتیاز احمد، محولہ بالا، ص ۴۲۔ (۳۶) ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی مرحوم۔ دنیائے تحقیق وادب کی قابل فخر شخصیت، تعمیر حیات، محولہ بالا، ص ۳۱۔ (۳۷) تعمیر حیات، لکھنؤ، ۲۵ر فروری ۲۰۲۱ء، ص ۲۲۔ (۳۸) ڈاکٹر امتیاز احمد، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، تہذیب الاخلاق، محولہ بالا، ص ۴۲۔ (۳۹) معارف، وفیات، ۲۰۷/ ۲، فروری ۲۰۲۱ء، ص ۱۵۱۔

مسلم تعلیمی نظام

ڈاکٹر انیس الرحمان ☆

اسلام میں ''حقیقت کا علم'' بہم پہنچانا تعلیم ہے۔اگر انسان معرفت حق حاصل نہ کر سکے تو اس نے تعلیم حاصل نہیں کی۔پیغمبروں کے پاس بادشاہت و دولت نہیں تھی مگر انہیں معرفت حق حاصل تھی۔ اس لیے وہ تعلیم یافتہ شمار کیے جاتے ہیں۔تعلیم انسان میں مشاہدہ وفکر، اللہ کی حاکمیت کا احساس اور آخرت کی فکر کی صلاحیتیں پیدا کرتی ہیں۔تعلیم کا اسلامی مطلب صرف مذہبی تعلیم (قرآن وحدیث) حاصل کرنا نہیں ہے کیونکہ اسلام دین و دنیا کی تفریق نہیں کرتا۔ ہر وہ علم جو انسان میں مندرجہ بالا صلاحیتیں پیدا کرتا ہے وہ اسلام کی تعلیم میں شامل ہے خواہ دنیا کے لوگ اس کو عصری علوم کہتے ہوں یا دینی علوم۔اس لیے کہ اسلام میں نصب العین اور مقاصد حیات کی اہمیت ہے۔اسلام میں تعلیم کے لفظ کو وسیع معنی میں لیا گیا ہے اس لیے اس میں تربیت بھی شامل ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تعلیم اور تربیت لازم وملزوم ہیں اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

ان تمام نکتوں و گوشوں سے ایک نتیجہ یہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ تعلیم کے جہاں اور بہت سے مقاصد ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں وہیں تعلیم کا اعلیٰ ترین مقصد ذات کی تکمیل، اعلیٰ انسانی اوصاف کا حصول اور پوشیدہ صلاحیتوں کا نکھار ہے اور ان چیزوں کے ذریعہ فرد کو ملک وملت بلکہ پوری انسانیت کی حقیقی خدمت کے لیے تیار ہونا ہے۔

یوں بھی کہا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ وہ شخص نہیں ہے جس کے پاس بڑی بڑی ڈگریاں ہوں یا اس نے اعلیٰ اور مہنگے اسکول میں تعلیم حاصل کی ہو۔درحقیقت تعلیم یافتہ وہ شخص ہے جو ذہنی طور پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

☆شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ (Mob: 9891755509)

تعلیم یافتہ وہ شخص ہے جو اچھائی و برائی میں تمیز کر سکے یعنی اسے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو کہ اچھائی کا انجام اچھائی ہے اور برائی کا برائی اور وہ زندگی میں کامیابی یا اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کسی برائی میں مبتلا نہ ہو بلکہ صرف وہی قدم اٹھائے جو اس کے لیے برائی کا سبب نہ بنے۔

تعلیم یافتہ وہ شخص ہے جسے نیکی و بدی کا شعور ہو یعنی وہ اپنی زندگی کے اصولوں کو وضع کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھتا ہو کہ اپنے کسی عمل سے وہ گنہگار نہ ہو جائے۔ کہیں بھی اپنی حد سے نہ گذرے، جو خدا نے اس کے لیے بہتر بنایا ہے اس پر قناعت کرے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے کسی کے دل کو تکلیف پہنچے۔ جسے اپنی روزی حاصل کرتے وقت یا روزمرہ کے واقعات میں کوئی فیصلہ کرتے وقت اس بات کا احساس ہو کہ اس کے لیے کیا جائز ہے اور کیا ناجائز، جسے دین و دنیا کے بارے میں کم از کم اتنی سمجھ ضرور ہو کہ خدا نے اسے یہ زندگی ضائع کرنے کے لیے نہیں دی ہے۔ بلکہ اللہ نے اس پر جو ذمہ داریاں سونپی ہیں اسے وہ پورا کرے۔

تعلیم کی اہمیت: کسی بھی تہذیب و ثقافت کی بقا تعلیم کے بغیر ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے قبل بھی تعلیم کا وجود نظر آتا ہے، عہد قدیم میں ہندوستان، یونان، بابل، نینوا، روم، چین، مصر، اشوریا علم کے مراکز کے طور پر جانے جاتے ہیں، ہندوستان الٰہیات، طب اور ہیئت میں اپنا مقام رکھتا تھا جب کہ چین نے اخلاقی تعلیم میں ایک حیثیت پیدا کر لی تھی، لیکن ان سب سے بڑھ کر یونان کے فلاسفر سب پر سبقت لے گئے، انھوں نے انسانی دماغ کو ایک قیمتی مواد فراہم کیا یہی وجہ ہے کہ یونان کو تمام متمدن ممالک میں سرفہرست رکھا جاتا ہے۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تعلیم: تعلیم کا سلسلہ مسلمانوں کے درمیان صدیوں سے جاری ہے۔ سرزمین حجاز مذہب اسلام اور علم دونوں کا گہوارہ تھی، ان کی درس گاہ میں زبان وادب، شاعری، گھوڑسواری، تیراکی اور تیراندازی وغیرہ جیسے علوم وفنون شامل تھے۔ طلوع اسلام کے بعد مکہ مکرمہ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا مکان اسلام کی پہلی درس گاہ بنا۔ دارارقم مسلمانوں کی تربیت گاہ اور درس گاہ تھی، مسجد نبویؐ کی صفہ باضابطہ درس گاہ تھی۔ قرآن وحدیث اور مسائل زندگی ہی نصاب تھا۔ نزولی اعتبار سے قرآن کریم کی پہلی آیت ''اقراء باسم ربک الذی خلق''(۱) تعلیم کی اہمیت کو بخوبی واضح کرتی ہے۔ اللہ رب العزت نے سب سے پہلے علم سیکھنے کا حکم دیا ہے۔ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو بھی

سب سے پہلے ضروری اشیا کا علم دیا گیا جیسا کہ قرآن مجید میں ''وعلم آدم الاسماء کلھا'' (۲) اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھلائے، وارد ہوا ہے۔

علم اور علماء کی فضیلت پر قرآن مقدس میں کئی واضح آیات موجود ہیں:

یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات (۳)	اللہ تعالی تم میں سے ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جنہیں علم دیا گیا، درجے بلند کردے گا۔
قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (۴)	آپ کہیے کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔

علماء کی فضیلت میں قرآن نے کیا خوب فرمایا ہے:

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (۵)	خدا سے اس کے بندوں میں (حقیقی طور پر) ڈرنے والے صرف علماء ہی ہیں۔

علم اور علماء کی فضیلت میں نبی آخر الزماں حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات بھی وارد ہوئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (۶)	علم کا حصول ہر مسلمان شخص پر فرض ہے۔

ایک دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا

العلماء ورثۃ الأنبیاء (۷)	علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

خلفائے راشدین کے عہد میں اسلام عرب کی سرزمین سے نکل کر ایران وشام اور دنیا کے دیگر خطوں میں پہنچا، مختلف قوموں سے تعلقات استوار ہوئے تو تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی، جگہ جگہ درسگاہیں کھولیں گئیں۔ قرآن اور حدیث کی تعلیم کے علاوہ شہ سواری، لغت عربی اور دیگر زبانوں کی تدریس، نحو وصرف اور فقہ پر خاص توجہ دی گئی۔

مسلمانوں کو جب سیاسی عروج حاصل ہوا تو انہوں نے نہ صرف مذہبی علوم کو بلکہ دانش ورانہ علوم کو بھی ترقی دی۔ مکہ، مدینہ، بغداد، بصرہ، کوفہ، دمشق، غرناطہ، قرطبہ، قاہرہ، قسطنطنیہ، قیروان، بدخشاں، رے، اصفہان، شیراز، تبریز، نیشاپور، بلخ، بخارا، سمرقند، ہرات، نِسا Nisa، ترمذ وغیرہ میں واقع علوم کے مراکز سے فارغ التحصیل علماء اور دانشوروں کو نور علم کا علم بردار قرار دیا گیا۔

اسلام کے ساتھ ہر جگہ مسجدیں تعمیر ہوگئیں اور اس زمانے میں علمی مرکز یہی مسجدیں تھیں، تعلیمی نصاب میں مطالعۂ قرآن پاک، حدیث، فقہ، تفسیر کے علاوہ عصری علوم میں تاریخ، ادب، خوش خطی، فلسفہ، علم کیمیا، فن تعمیر، فن نقاشی، خطابت، کتابت وغیرہ شامل تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مساجد کی چہار دیواری سے بڑے بڑے علماء، فقہاء، ادباء، دانشور، اطباء وحکماء پیدا ہوئے، کیونکہ مسجد بیک وقت عبادت گاہ بھی تھی، تربیت گاہ بھی اور اچھے انسان ڈھالنے کی کارگاہ اور علم وعمل کی شاہراہ بھی تھی۔

جن مساجد کو دینیات کی تعلیم کے اہم مراکز کے طور پر شہرت حاصل ہوئی ان میں سے خاص طور پر جامع ازہر مصر، جامع عمرو مصر، جامع دمشق شام، جامع المنصور شام، قابل ذکر ہیں۔

مسلم حکمرانوں نے مختلف شہروں میں یونیورسٹیاں قائم کیں، اسپین میں تعلیمی ادارے قائم کیے۔ بعض مورخین سلجوقیوں کے عہد سے مدارس کے قیام کو شمار کرتے ہیں جو غلط ہے کیونکہ سلجوقیوں کا دور ۴۲۹ھ سے شروع ہوتا ہے جب کہ جامعہ قرطبہ کو عبدالرحمان سوم نے قائم کیا اور اس کا عہد ۹۱۲ء تا ۹۱۶ء ہے۔ اس کے بعد فاطمی خلیفہ معزالدین نے قاہرہ (مصر) میں جامع ازہر کو ۹۷۲ء میں قائم کیا۔ جہاں کے فارغ طلبہ نے دینیات، فلسفہ ومنطق، فلکیات اور فن خطاطی وغیرہ میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ واضح ہو کہ مصر میں فاطمیوں کی حکومت ۹۶۹ء میں شروع ہوئی۔

فلپ کے ہٹی نے لکھا ہے کہ جامعہ قرطبہ کو دنیا کے تمام تعلیمی اداروں میں امتیازی مقام حاصل تھا۔ عبدالرحمان سوم کے جانشین الحکم کے بارے میں اس نے لکھا ہے:

> He granted munificent bounties to scholars and established twenty-seven free schools in the capital. Under him the University of Cordova, founded in the principal mosque by Abd-al-Rahman III, rose to a place to pre-eminence among the educational institutions of the world.

> ”اس نے اصحاب علم کو زبردست داد و دہش سے نوازا اور دارالحکومت میں ستائیس مدارس قائم کیے جہاں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ جامعہ قرطبہ جسے عبدالرحمان

سوم نے جامع مسجد میں قائم کیا تھا، الحکم کے دور میں اس کا دنیا کی اہم تعلیم گاہوں میں شمار ہونے لگا"۔(۸)

سلجوقی شہنشاہ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے ایرانی وزیر نظام الملک طوسی (۱۰۱۹ء تا ۱۰۹۲) نے مدرسہ نظامیہ قائم کر کے ان اداروں پر ہونے والے خرچ کا انتظام جائدادوں کو وقف کر کے کیا، ان وقف شدہ جائدادوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کو اساتذہ کی تنخواہ، طالب علموں کے قیام و طعام اور آسائشی زندگی پر خرچ کیا جاتا، شیعہ اور معتزلہ کے مقابلہ میں اشاعرہ نے اس مدرسہ کو اپنا مرکز بنایا، عمر خیام اس کے مربی بنے، غزالی (م ۱۱۱۱ء) نے اس میں درس دیا۔ نظام الملک نے ان کے علاوہ مختلف مفتوحہ ممالک بلخ، نیشاپور، اصفہان، ہرات، مرو، موصل اور خراسان وغیرہ میں مدارس قائم کیے۔

عام طور پر اہل علم کے درمیان یہ خیال پایا جاتا ہے کہ باضابطہ طور پر عالم اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ "مدرسہ نظامیہ بغداد" ہے، لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ علامہ سبکی لکھتے ہیں:

> "یہ گمان کیا جاتا ہے کہ نظام الملک طوسی ہی نے سب سے پہلے مدرسوں کی بنیاد رکھی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ مدرسہ بیہقیہ نیشاپور، نظام الملک کی پیدائش سے بھی پہلے قائم ہو چکا تھا۔ نیز مدرسہ سعدیہ نیشاپور، جسے سلطان محمود کے بھائی نصر بن سبکتگین نے اس زمانے میں تعمیر کرایا تھا جب وہ وہاں کا والی تھا۔ تیسرا مدرسہ بھی نیشاپور میں ہی تھا جسے واعظ و صوفی ابوسعید اسماعیل بن علی مثنی استرآبادی نے بنایا تھا، چوتھا مدرسہ بھی یہیں تعمیر ہوا جسے ابواسحاق اسفرائینی نے تعمیر کرایا۔ یہ صریح واقعہ ہے کہ یہ مدارس اس مدرسہ (مدرسہ نظامیہ) سے قبل تعمیر پا چکے تھے"۔(۹)

ہندوستان میں تعلیمی اداروں کا قیام: ہندوستان میں مدارس کی تاریخ اور اس کی خدمات نہایت روشن اور تابناک ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے اور یونیورسٹی کے نشانات موجود تھے جیسے نالندہ اور وکرم شیلا، جن میں طب، فلسفہ، ہندو مذہب کی بنیادی تعلیم، سنسکرت اور ادب وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔

ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون اور مسلم تعلیمی اداروں کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ اس ملک میں مسلمانوں کی فاتحانہ آمد، مسلمانوں نے جب سرزمین ہند پر قدم رکھا تو اپنے ساتھ علم

کی سرپرستی، علماء کی قدردانی وحوصلہ افزائی کی وہ روایتیں بھی ساتھ لے کر آئے جن کو اسلام نے قائم کیا تھا، ایک طرف انہوں نے ملک میں حسین وجمیل عمارتیں تعمیر کیں تو دوسری طرف علوم وفنون اور تہذیب وثقافت کی شمعیں روشن کیں۔

جب محمد بن قاسم نے سندھ وملتان فتح کیا تو وہاں مساجد کی تعمیر کے ساتھ تعلیم کا بھی انتظام کروایا، محمد بن قاسم کے بعد دیبل بنی امیہ اور بنوعباسیہ کے دور میں علم وفضل کا مرکز رہا۔فتوح البلدان میں لکھا ہے:

> ”محمد بن قاسم کا جب ہندوستان میں ورود ہوا تو انہوں نے فتح کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم کے مراکز بھی قائم کرنا شروع کیا“۔(۱۰)

عہد غزنوی میں بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مساجد ومدارس قائم کیے گئے، جب محمود غزنوی نے شمالی ہند کو فتح کیا تو لاہور میں ایک مسجد تعمیر کی جس کا نام خشتی مسجد رکھا اور یہاں تعلیم کا بھی نظم کیا۔ابوالحسنات ندوی رقم طراز ہیں:

> ”۳۹۰ھ ۹۹۹ء میں سلطان محمود غزنوی سرزمین ہند کی طرف متوجہ ہوا اور ۴۰۹ھ ۱۰۱۸ء کے بعد انہوں نے قنوج کو فتح کرنے کے بعد غزنی واپس جا کر وہاں جامع مسجد اور مدرسہ کی بنیاد رکھی“۔(۱۱)

اسی طرح غوری، خلجی، لودھی، تغلق، سوری ومغلیہ سلاطین کے دربار علماء وفضلاء کا مرکز تھے، حکمراں اور امراء تعلیم کی ترویج واشاعت کے لیے بے دریغ روپیہ خرچ کیا کرتے تھے، حالانکہ تعلیم کے لیے کوئی علاحدہ شعبہ نہیں ہوتا تھا۔

واضح رہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست کا اصلی دور شہاب الدین غوری سے شروع ہوتا ہے، اس کا جانشیں شمس الدین التمش ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء میں تخت نشیں ہوا اس نے مدرسہ معزی کے نام سے دارالسلطنت دہلی اور بدایوں میں دو مدارس قائم کیے، التمش کے بیٹے ناصر الدین نے بھی مدرسہ ناصریہ قائم کیا تھا۔

مسلمان بادشاہوں کے دور میں فروغ تعلیم حکومت کا ایک جز تھا، بلبن، ناصر الدین محمود، محمد بن تغلق، علاء الدین خلجی، فیروز تغلق سے لے کر مغلیہ دور کے آخری بادشاہوں تک ہر ایک نے

تعلیم کی اشاعت کے لیے جدو جہد کی۔

دہلی کی مرکزی حکومت کے ساتھ ساتھ صوبائی حکومتوں نے بھی اس سلسلہ میں خاص اقدام کیے، دکن کے فیروز بہمنی کا تعلیمی فروغ پر بڑا احسان ہے، اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ فیروز بہمنی دوسرے ممالک میں جہاز روانہ کرتا تھا تا کہ علماء کا جم غفیر بہمنی مرکز پر باقی رہے، اسی طرح گولکنڈہ کے فرماں روا قطب شاہ نے کئی مدرسے اور دارالعلوم قائم کیے اور اس کی سرپرستی کی۔

عہد تغلق میں دہلی میں مدارس کی کثرت کے تعلق سے یہ عبارت ملاحظہ کریں، قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں لکھا ہے:

"فیھا الف مدرسۃ واحدۃ للشافعیۃ و باقیھا للحنفیۃ"۔(۱۲)

عہد اکبری میں آگرہ اور فتح پور سیکری میں متعدد مدرسے قائم ہوئے، مدرسہ ماہم بیگم یا خیر المنازل عہد اکبری کا مشہور مدرسہ ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر نے بڑے شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شہروں، قصبات اور گاؤں میں بھی مدارس قائم کیے اور مدرسین اور طالب علموں کے وظائف مقرر کیے۔ مسلم عہد حکومت کے چند مشہور مدارس میں سے مدرسہ معزی، مدرسہ ناصریہ/ مدرسہ غازی، مدرسہ و مقبرہ علاء الدین خلجی، مدرسہ حوض خاص (مدرسہ فیروز شاہی)، مدرسہ شاہی مسجد بدر پور، مدرسہ خیر المنازل، مدرسہ دارالبقاء، مدرسہ و مسجد شیخ عبدالنبی، مدرسہ عالیہ مسجد فتحپوری، مدرسہ غازی الدین اجمیری گیٹ دہلی، مدرسہ امینیہ سنہری مسجد قابل ذکر ہیں۔

مدارس کے علاوہ دہلی کا وہ مدرسہ جس کے فیوض و برکات سے سارے ہندوستان میں علم کا ایسا دور شروع ہوا جس کے اثرات کسی نہ کسی طرح آج بھی جاری ہیں، جسے مدرسہ رحیمیہ کے نام سے جانا جاتا ہے، یہ دہلی گیٹ کے قریب علاقہ مہندیان میں واقع ہے۔ یہ عہد عالم گیر میں قائم ہوا اور اس کے بانی شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد شاہ عبدالرحیم دہلویؒ تھے جو فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین و جامعین میں سے ہیں، شاہ ولی اللہ نے اپنے والد سے اسی مدرسہ میں تحصیل علوم کیا اور اسی مدرسہ سے حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ محمد اسحاق، حضرت عبدالقادر اور شیخ نذیر حسین محدث دہلوی رحمہم اللہ جیسے نابغۂ روزگار پیدا ہوئے، یہ وہ علماء ہیں جو یہاں کی مسند درس پر جلوہ افروز ہوتے رہے۔

ہندوستانی مدارس کا نصاب تعلیم : منگولوں کے ہلاکت خیز حملوں سے قبل جو نصاب تعلیم ایران اور وسط ایشیا میں رائج تھا وہی نصاب ترکوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں رائج ہوا، مسلمانوں میں فقہ اور اصول فقہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔

قرآن مجید چونکہ اسلامی علوم کا سرچشمہ ہے اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سب سے پہلے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دی جاتی، پھر عربی کی ابتدائی کتابیں اور ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی سکھائی جاتی تھی۔

پانچویں صدی سے ساتویں صدی تک ہندوستان کے مدارس میں کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اس کا ثبوت اب تک دستیاب نہ ہوسکا، آٹھویں صدی میں علما کے سوانح سے بہت ہی مختصر پتہ چلتا ہے کہ کون کون سی کتابیں رائج تھیں۔

اکبر کے دور کے مشہور عالم دین شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ہیں جن کی بدولت علم حدیث کا چرچا پورا شمالی ہندوستان میں ہوا، انہوں نے اپنی پوری زندگی علم حدیث کی نشر و اشاعت میں صرف کردی۔

عہد شاہ جہاں اور اورنگ زیب میں علامہ میر زاہد علم و فن کے سرتاج تھے یہی وہ بزرگ ہیں جن کے سلسلے میں قاضی مبارکؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا مشہور خاندان بھی ہے جن کی بدولت علم حدیث و تفسیر کو پورے ہندوستان میں چمکنے کا موقع ملا۔

درس نظامی: اٹھارہویں صدی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے نصاب تعلیم میں کچھ اصلاحات کی لیکن اس سلسلہ میں سب سے اہم کام ملا نظام الدین سہالوی نے انجام دیا، جو ایک نامور عالم، صوفی اور فرنگی محل خاندان کے جد امجد تھے، ان کی تعلیمی اصلاحات ہندوستان میں اسلامی علوم کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، اس نصاب کو درس نظامی کے نام سے جانا جاتا ہے، قدیم نصاب میں ہر فن میں بیرون ہند کے علما کی کتابیں شامل تھیں لیکن درس نظامی کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ہندوستانی علما کی کتابیں تھیں، نیز کتابوں کے بوجھ کو ختم کرکے مختصر مگر جامع کتابوں کو شامل کیا گیا، یہ نصاب ہندوستان کے طول و عرض میں نافذ ہوا، روایتی علوم میں تفاسیر کے علاوہ علم حدیث میں کچھ کتابوں کا مزید اضافہ کیا گیا، لیکن جغرافیہ اور تاریخ کو نظرانداز کردیا گیا اور ادب کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی، درس نظامی کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا، تفسیر، حدیث، دینیات، فقہ، اصول فقہ، منطق و فلسفہ، علم نحو، فصاحت و بلاغت، قواعد و اشتقاق اور ریاضی، ان فنون کے تحت مختلف کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔

ملا نظام الدین سہالوی کے ذریعہ ترتیب شدہ نصاب کو پورے ہندوستان نے قبول کیا اور اسے پڑھ کر بڑے بڑے باکمال اساتذہ پیدا ہوئے۔

درس نظامی اپنے ابتدائی دنوں کے اعتبار سے نہایت مستحکم اور پائدار نصاب تھا اس وقت زمانہ کا مزاج یہی تھا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس نصاب کو بھی نئے سرے سے ترتیب دینے کی ضرورت تھی لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس قدیم ڈھانچہ پر نئی بنیاد رکھنے کی کوشش کی گئی، آج بھی ان مدارس کے نصاب تعلیم پر تبدیلی کی بات کی جاتی ہے تو ایک طبقہ ناراضگی کا اظہار کرتا ہے حالانکہ اگر روایتی علوم میں تبدیلی نہ کرکے سماجی علوم کو اس نصاب میں جگہ دی جائے جو موجودہ زمانے کے اعتبار سے مفید ہیں تو مسلمانوں کی ترقی کی راہ اور ہموار ہو جائے گی۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت: سلجوقیوں کے عہد میں نظام الملک طوسی (۱۰۱۹ء تا ۱۰۹۲ء) نے جو مدارس قائم کیے تھے وہ تمام مدارس اہل سنت کے علم بردار تھے، بعد کے ادوار میں عالم اسلام میں اور خاص طور پر عراق و ایران اور وسط ایشیا وغیرہ میں جو مدارس قائم ہوئے وہ اسی نظامیہ مدرسوں کے پرتو تھے، ان میں تھوڑا سا فرق یہ تھا کہ کہیں کہیں نصاب میں تبدیلی کی گئی تھی یا نصاب تو ایک ہی جیسا تھا لیکن کتابیں مختلف تھیں۔

واضح رہے کہ مسلمانوں میں تعلیم ابتدائے اسلام سے رہی ہے لیکن بدلتے زمانے کے مطابق اس تعلیمی نظام میں تبدیلی نہیں لائی گئی خاص طور پر انیسویں صدی کی دنیا میں نصاب کے اندر تبدیلی کی اشد ضرورت تھی اسی فکر کی جانب برصغیر میں سرسید احمد خاں متوجہ ہوئے اور قوم کو زوال وانحطاط سے نکالنے کے لیے ایک اپنا تعلیمی نظریہ پیش کیا۔

سرسید احمد خاں نے اپنے دور کے حالات کے آئینے میں آنے والے سائنسی ترقی کے زمانے کا بالکل صحیح اندازہ لگا لیا تھا اور اسی لحاظ سے وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے لیے بے قرار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آیندہ کے سیاسی، سماجی، معاشی اور سائنسی ترقی کے ماحول میں جدید مغربی تعلیم کے حصول کے بغیر کسی طرح بھی مسلمان زمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے والے نہیں ہیں، اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی عصری تعلیم پر زور دیا۔ اس کے لیے جدید طرز کے تعلیمی اداروں کے قیام کو ضروری قرار دیا اور ایک ایسے تعلیمی ماحول کی تشکیل کا منصوبہ تیار کیا جس

میں ایمان کے تحفظ و بقا اور مذہب و ثقافت کی برقراری کے ساتھ مسلمان دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے سامنے مرعوب نہ ہوں۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

"تم اپنے حال کا بزرگوں کے حال سے مقابلہ کرو۔آپ کے بزرگ جس زمانے میں تھے انہوں نے اپنے تئیں اس زمانہ کے لائق بنالیا تھا اس لیے وہ دولت وحشمت اور عزت سے نہال تھے جس زمانہ میں ہم ہیں ہم اپنے تئیں اس زمانہ کے لائق نہیں بنایا اور اس لیے نکبت اور ذلت میں ہیں"۔(۱۳)

سرسید نے قومی تعلیم کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ایک مخصوص تعلیمی پروگرام مرتب کیا تھا۔اس تجزیہ سے جو نتائج اخذ کیے اس کو یوں بیان فرماتے ہیں:

"کوئی قوم عزت نہیں پاسکتی جب تک کہ تعلیم اس مقدار مناسب سے اس قوم میں رائج نہ ہو۔اور اس مقدار مناسب کا اندازہ حسب ذیل تفصیل سے ہوسکتا ہے۔ضرورت ہے کہ اس قوم میں ایک گروہ معتد بہ اعلیٰ تعلیم کا ہو جس میں سے کوئی کسی علم میں دستگاہ کامل رکھتا ہو اور اس طرح تمام علوم کے کامل لوگ اس قوم میں موجود ہوں۔جن کی عقل وفہم سے ہماری قوم کو عزت وفخر ہو اور پھر ان لوگوں کی تعداد بھی ایسی ہو جن پر اطلاق النادر کالمعدوم کا نہ ہو۔اس کے بعد ایک بہت بڑا گروہ متوسط درجہ تعلیم کا اس قوم میں ہونا چاہیے جو عالی رتبہ مصنفوں کی علمی تصنیفات کو نہایت عمدگی سے جانتا ہو۔اور ہر ایک دقیقہ اور باریک سے باریک اصول سے بخوبی واقف ہو اور تعلیم کے ذریعہ سے وہ اپنی باتیں قوم کو سکھا سکتا ہو۔اس گروہ کی تعداد ایسی ہونی چاہیے کہ بلحاظ قومی تعداد کے ایک مناسب رکھتی ہو۔اس کے بعد ادنی درجہ تعلیم کا ہے مگر اس میں تین قسم کے گروہوں کا ہونا ضروری ہے۔ایک گروہ ایسا ہو جو کل قوم سے تعداد میں ایک مناسبت معقول رکھتا ہو۔اور اس قدر تعلیم پائی ہو کہ خاص اپنی عقل وعلم سے اپنے کاموں کو انجام دے سکے۔اس کے بعد اس درجہ کے ایسے لوگ کی کثیر تعداد ہونی چاہیے جو اپنے دنیوی کاموں کا انجام بخوبی تمام کرسکتے ہوں اور چونکہ یہ لوگ محض جاہل نہیں ہوں گے تو ضرور ان میں اس قدر علم کی

روشنی ہوگی جو ترقیاں علوم وفنون میں ہر روز ہوتی ہیں اس کے وسیلے سے ان سے فائدہ اٹھاسکیں۔جن قوموں میں ان سب مراتب کے تعلیم یافتہ مناسب تعداد میں موجود نہ ہوں اس قوم کی کبھی ترقی نہیں ہوسکتی۔اور نہ دوسری قوم کی نگاہ میں وہ قوم کچھ عزت حاصل کرسکتی ہے‘‘۔(۱۴)

علامہ شبلی کو بے حد افسوس تھا کہ مدارس کے نصاب تعلیم کا خاکہ سیاسی آواز سے بالکل خالی ہے۔اس میں تاریخی شعور پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں، بلکہ تاریخی کتابیں بھی فن انشاء کے اعتبار سے پڑھائی جاتی ہیں۔

دراصل مولانا شبلی علما کی ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتے تھے جو زمانے کی نبض سمجھتے ہوں۔ عصری مسائل کا ادراک رکھتے ہوں، انگریزی جانتے ہوں تاکہ یورپ کی علمی خیانتوں کا پردہ فاش کرسکیں اور ساتھ ہی ساتھ اس تعلیم سے ان کے معاش کے مسائل بھی حل ہوسکیں۔

ہماری رائے ہے کہ جدید اور قدیم کی جداگانہ تعلیم کے موجودہ طریقے کو ختم کرکے وحدانی طریقۂ تعلیم کو اختیار کیا جائے۔یعنی عام مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں جملہ جدید علوم وفنون کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور دینیات کی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہوتا کہ وہ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے دین کی زبان اور بنیادی مذہبی امور سے بھی واقف ہوجائیں۔

جہاں تک اعلیٰ مذہبی تعلیم کا تعلق ہے تو اس کے لیے الگ سے محدود تعداد میں اعلیٰ قسم کے دینی مدارس قائم کیے جائیں جو کثیر الجہات ہوں،لیکن ان مدارس کا کسی مخصوص مسلک و جماعت سے تعلق نہ ہو اور ان میں ان ذہین لڑکوں کو داخل کیا جائے جو طبعی طور پر دینی مزاج کے حامل اور قناعت پسند ہوں اور خدمت دین کا سچا جذبہ رکھتے ہوں۔بہر حال ہم جو بھی نظام تعلیم اختیار کریں، ہمارا نظام تعلیم خدارسی اور اخلاقی تعلیم سے مزین ہونا چاہیے۔

بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تعلیمی فکر پر غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے کبھی بھی جدید عصری تعلیم کی مخالفت نہیں کی۔ہاں انیسویں صدی کے ثقافتی اور معاشرتی حالات میں مولانا سمیت دیگر اکابر کا یہ تصور ضرور تھا کہ اسلامی علوم وفنون سے مسلمانوں کو نابلد رکھ کر محض معاشی ضرورت اور عقلی بیداری کے نقطۂ نظر سے صرف جدید یا عصری علوم کا حصول مسلمانوں

میں غلط نتائج پیدا کرے گا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء نے جو نظام تعلیم اور نصاب تعلیم رائج کیا تھا وہ دراصل ہندوستان میں کتاب وسنت کی تعلیم عام کرنے، اسلامی تہذیب وثقافت اور تشخص کے تحفظ وبقا کو یقینی بنانے کے مقصد کے تحت تھا اور جس میں عصری تعلیم یا انگریزی تعلیم کی شمولیت سے اصل مقصد کے حصول میں خلل واقع ہونے کا امکان تھا اس لیے اس وقت اس تعلیم میں وہ عصری علوم کی پیوند کاری کو غیر مناسب تصور کرتے تھے۔ بہر حال مولانا محمد قاسم نانوتوی کا اپنا مخصوص سیاسی، تعلیمی اور مذہبی نظریہ تھا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کہتے ہیں کہ کسی ملک کا نظام تعلیم ہی انسانی اخلاقیات میں وہ فکر پیدا کرتا ہے جو ایک آزاد قوم اپنے آزاد نظام زندگی کو چلانے کے لیے بناتی ہے۔

ہمارا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جدید نظام سے متعلق ہو یا قدیم نظام تعلیم سے، اخلاق وشائستگی مہذب عادات اور ضبط ونظم کی بنیادی تربیت سے عاری ہے۔ مغربی تعلیم خدا پرستی سے خالی ہے نوجوان نسل مغربی علوم سے واقف ہے مگر ان کی خوبیوں کو اپنانے کے لیے تیار نہیں۔ ان میں نہ فرض شناسی ہے، نہ مستعدی وجفاکشی، نہ ضبط اوقات، نہ صبر نہ عزم واستقلال ہے، نہ باقاعدگی وباضابطگی، نہ ضبط نفس ہے۔ ہمیں اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ کیا ان کے بغیر ہم ترقی کر سکتے ہیں۔

اسلامی اخلاقیات کے لیے تاریخ سے مثالیں پیش کر کے طلبہ کو ذہن نشین کرایا جائے کہ اسلام ایک ایسے نظریے کا نام ہے، جس میں بلند سیرت وکردار کا ہونا لازمی ہے۔ طلبہ میں یہ خیال پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام جن اوصاف کی مذمت کرتا ہے وہ بھی ان کی مذمت کریں اور جن اوصاف کو اسلام محمود اور مطلوب قرار دیتا ہے ان کو وہ خود پسند کریں اور اپنے اندر ان کی نشوو نما کریں۔(۱۵)

قیادت کی صلاحیت: علامہ اقبال کی شاعری کا محور اور ان کی آرزو اور جستجو کا مرکز قوم کے نوجوان طلبہ ہی تھے جو ان کے نزدیک ستاروں پر کمندیں ڈالنے، عقابی روح بیدار کرنے اور خودی کے زور پر تمام دنیا پر چھا جانے کی صلاحیتوں سے بہرور ہوں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بقول تعلیم کے حسب ذیل مقاصد ہونا چاہیے تب ہی انسان دنیا کی امامت کا خواب دیکھ سکتا ہے۔

۱۔شائستگی، پاکیزگی، صفائی، حسن و قبح اور ذوق سلیم۔ ۲۔اخلاق حسنہ، انفرادی، عائلی اور اجتماعی۔ ۳۔انضباط، باقاعدہ اور مہذب طریقہ سے سوسائٹی میں رہنے اور کام کرنے کے ڈھنگ، محاسبہ نفس کی عادت، احساس فرض، احساس ذمہ داری۔ ۴۔وسعت قلب، وسعت نظر، وسعت تصور، بلند حوصلگی، خودداری۔ ۵۔عزم و ارادہ کی پختگی، متانت و سنجیدگی، خلوص نیت اور یہ ضروری صفت کہ جس معاملہ سے بھی دلچسپی لیں اس میں ان کی دلچسپی منافقانہ طرز کی نہ ہو۔ ۶۔جرأت و دلیری، جفاکشی، چستی، ہر طرح کا کام کر لینے کی صلاحیت، زندگی کے ہر پہلو سے کچھ نہ کچھ واقفیت، نہ صرف معلومات کی حد تک بلکہ عملاً بھی۔ ۷۔اسلامی نصب العین کا عشق اور گہرا اسلامی جذبہ جو روح اور قلب میں اترا ہوا اور جس کا اظہار تمام حرکات و سکنات سے ہو۔ ۸۔جماعتی زندگی کے لیے وہ مناسب اوصاف جو قرآن و حدیث میں بیان کیے گئے ہیں۔ ۹۔اسلامی اوزان اور پیمانوں سے ہر چیز کو ناپنے اور تولنے کی عادت۔ ۱۰۔ضروری انتظامی صلاحیت۔(۱۶)

سابق وزیر تعلیم ہند مولانا ابوالکلام آزادؒ مدرسوں کی جدید کاری کے قائل تھے۔ان کی نظر میں مدرسوں میں بہت سے ایسے امور تھے جن میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت تھی۔ مدارس کے نصاب، مدارس کی جدید تعلیم سے استواری یا مدرسوں کے اندر جاری نظام تدریس یا طریقۂ تدریس میں تبدیلی وغیرہ امور ایسے تھے جن کے بارے میں مولانا آزاد کا خیال تھا کہ یہ تقریباً سو سال پہلے ہی تبدیل ہو جانے چاہیے تھے۔زیر غور رہے کہ وہ یہ بات ۱۹۴۷ء کے زمانہ میں کہہ رہے تھے۔

مولانا آزاد نے ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں اسلامی فن تدریس کا پس منظر اور نصاب تعلیم پر تقریر فرمائی تھی۔اس تقریر میں انھوں نے تقریباً متذکرہ بالا سارے سوالوں کا جواب دیا ہے۔انھوں نے مسلمانوں کے علمی زوال کو ساتویں صدی ہجری سے منسوب کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

> ”ساتویں صدی کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اچانک اسلامی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، اس دور کو میں دور تنزل قرار دیتا ہوں.... سب سے پہلی چیز جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ علم کی ترقی کے لیے جو بنیادی چیز ہے، جس کو عربی میں نظر و اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے، اچانک غائب ہو جاتی ہے اور ساتویں صدی کے بعد

جمود ہر گوشے پر چھا گیا''۔(۱۷)

چنانچہ مدرسوں میں درس نظامیہ کا جو نصاب پڑھایا جاتا ہے وہ دراصل ترقی کے زمانہ کا نہیں اس تنزل کے زمانہ کا نصاب ہے جس کی وجہ سے ہمارے مدارس کے فارغین میں وہ نظر واجتہاد نہیں پنپ رہا ہے جس کی مسلم سماج کو ضرورت ہے۔انہوں نے کہا کہ:

''ہندوستان میں اول ہی روز سے اسلامی علوم کے درس وتدریس کی بنیاد جو قائم ہوئی تھی وہ تنزل کے دور کا نتیجہ تھی، ترقی کے دور کا نتیجہ نہیں تھی اس کے خمیر میں تنزل کا مواد موجود تھا۔ساتویں صدی ہجری سے پہلے اسلامی علوم کی ترقی کا دور ختم ہو چکا۔چھٹی صدی میں تاتاریوں کی بغاوت، خلافت کا خاتمہ اور بغداد کا قتل عام ان تمام چیزوں کا جو عالم گیر اثر پڑا علوم اسلامیہ نیز ان کے دماغی اور علمی حالت سے نتیجہ یہ نکلا کہ ہر گوشے میں خرابیاں پیدا ہوئیں اور قدرتی طور سے یہ جو ایک گوشہ تھا درس وتدریس میں علوم کا وہ بھی اس سے متاثر ہوا''۔(۱۸)

جدید نصاب تعلیم کا خاکہ: تعلیم کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے نصاب کا موزوں انتخاب ضروری ہے۔بے نصاب نظام مقاصد تعلیم کو پورا نہیں کر سکتا۔

ابتدائی سطح پر اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں طلبہ کو اتنی استعداد ہونی چاہیے کہ وہ براہ راست قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کے متون کو از خود حل کر سکے کیونکہ کوئی شخص اسلام کی روح کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک قرآن کو براہ راست اس کی اپنی زبان میں سمجھنے کے قابل نہ ہو جائے۔

عربی کے علاوہ انگریزی یا کوئی اور یورپین زبان اس حد تک پڑھائی جائے کہ مذکورہ زبان کی کتابیں سمجھ سکیں اور ان کا ترجمہ کرنے کے قابل ہو سکیں اور مستقبل میں مذکورہ بالا زبانوں میں ریسرچ کرنے کی صلاحیت وقابلیت پیدا ہو جائے۔

اسلامی زندگی کو استوار کرنے کے لیے قرآن کی تعلیمات کو اس قدر ثانوی نصاب میں شامل ہونا چاہیے کہ وہ ابتدائی تحقیقی مطالعہ کی تیاری کے لیے مفید ثابت ہو سکے، اس کے ساتھ ساتھ اصول حدیث

اور حدیث کی ایسی مختصر کتاب جس سے تحقیقی مطالعہ کے لیے راہ ہموار ہو، نصاب میں داخل کرنا چاہیے۔

ذہنی تربیت اور آئندہ جماعتوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ریاضی کو بھی شامل کر لینا چاہیے۔ جغرافیہ جو طبعی، عالمی، عرب اور برصغیر کے متعلق ہو، تاریخ اسلام، انبیاء اور صحابہ کی سیرت، نیز پاک وہند کی تاریخ ضروری حد تک نصاب میں شامل ہونی چاہیے۔

اسلامی عقائد، اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب وتمدن کے متعلق واضح معلومات کا ابتدائی تعلیم کے نصاب میں شامل ہونا لازمی ہے۔ نصاب میں لچک کے جدید تصور اور نفسیاتی اصولوں کے بالکل مطابق عمر کے ساتھ ساتھ جن مسائل کا جاننا بچوں کے لیے ضروری ہے وہ ضرور نصاب میں شامل کرنے چاہئیں۔

عملی لحاظ سے بھی طلبہ کی جسمانی اور فنی تربیت پر توجہ مرکوز ہونی چاہیے۔ علوم اسلامی اور تاریخ وفلسفہ ومعاشیات وقانون پر زیادہ زور دینے کی ضرورت محتاج بیان نہیں، بعض بڑے تعلیمی اداروں میں اختصاص کے شعبے اپنی اہمیت کا احساس دلا رہے ہیں، اس طریقہ کو بڑے پیمانہ پر رائج کرنے کی ضرورت ہے۔

ہر طالب علم کو مجموعہ علوم پڑھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ انسان کا علم اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ تمام علوم کی معمولی شُدبُد بھی انسان میں پیدا ہونا قدرے محال ہے۔ اس لیے ایک مخصوص علم میں قابلیت کرنے کا طریقہ اپنانا چاہیے۔

خلاصۂ کلام: نظام تعلیم کو اس طرح مربوط کیا جائے کہ قدیم وجدید نظام تعلیم کی تفریق ختم ہو جائے۔ اس باہمی ربط کی بنیاد بہرحال اسلام کے ابدی اصول پر ہونے چاہئیں۔

مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم کی تدوین وترتیب اس طرح کی جائے کہ تمام افراد چاہے وہ ڈاکٹر ہوں یا انجینئر، استاد ہوں یا وکیل، تاجر ہوں یا کسی اور پیشہ سے متعلق ہوں، اپنے پیشہ میں مہارت کے علاوہ اول وآخر صحیح مسلمان ثابت ہوں، اساتذہ کو نہ صرف علمی قابلیت کا مظاہرہ کرنا چاہیے بلکہ اپنے کردار وسیرت سے بھی طلبہ پر اثرانداز ہونا چاہیے، اساتذہ کے انتخاب میں ان کی علمی اور پیشہ وارانہ لیاقت کے علاوہ ان کے نظریات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ بچوں کو ابتدا ہی سے ایمان کی پختگی اور عمل صالح کی تعلیم دینی چاہیے۔ توحید ورسالت کا تصور بچے کے ذہن میں شروع عمر ہی سے

راسخ کیا جانا چاہیے۔

طلبہ میں اخلاق حسنہ، شائستگی، پاکیزگی، ذوق سلیم، وسعت نظر، خودداری، جرأت و دلیری، جفاکشی اور خود کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ طلبہ کو معاشرتی مسائل سے واقفیت بہم پہنچانی چاہیے۔ نظام تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جائے جس سے اسلامی کلچر اور تہذیب کا احیا ہو سکے، مختلف مضامین کو از سر نو اس طرح مرتب کیا جائے کہ اسلامی نظریات کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔

ان گذارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے آیئے آگے بڑھیے اور ثابت کیجیے کہ ہم کل بھی اقوام عالم کے امام تھے اور آج بھی دنیا بھر کو اپنی تقلید پر مجبور کر سکتے ہیں۔

اٹھ کے اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

حوالہ جات

(۱) سورۃ العلق، آیت ۱۔ (۲) سورۃ البقرہ، آیت ۳۱۔ (۳) المجادلۃ، ۱۱۔ (۴) الزمر، ۹۔ (۵) فاطر، ۲۸۔ (۶) ابو عمر یوسف بن عبد البر القرطبی، مختصر جامع بیان العلم و فضلہ و ما ینبغی فی روایتہ و حملہ (اختصرہ الشیخ احمد بن عمر المحمصانی البیروتی) مکۃ المکرمۃ، المکتبۃ التجاریہ، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۔ (۷) احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، جلد دوم، مکتبہ شیخ الہند دیوبند، ۲۰۰۶، ص ۸۳۔

(۸) P.K. Hitti, The Arabs: A Short History, London: Macmillan & Co. 1948,P.131.

(۹) تاریخ سلجوق، ص ۷۵، بحوالہ احمد شلبی، تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ، ص ۱۰۶۔ (۱۰) بلاذری، ابوالحسن احمد بن یحییٰ بن جابر، فتوح البلدان، طبع اول، المطبعہ المصریہ الازہر ۱۹۳۲ء، ص ۴۲۵۔ (۱۱) ندوی، مولانا ابو الحسنات، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۳۶ء، ص ۱۴۔ (۱۲) القلقشندی، شیخ ابوالعباس احمد، صبح الاعشیٰ، مطبع امیریہ قاہرہ، مصر، ۱۹۱۵ء، ج ۵، ص ۶۹۔ (۱۳) ڈاکٹر نسیم اعظمی، تعلیم اور تعلیمی افکار، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۔ (۱۴) پروفیسر رشید احمد صدیقی، مغربی تعلیم کا تصور اور علی گڑھ میں اس کا نفاذ، مطبوعہ خدا بخش لائبریری پٹنہ، ص ۶۷۔ (۱۵) سید ابوالاعلیٰ مودودی، تعلیمات، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی ص ۳۰۔ (۱۶) ایضاً، ص ۱۳۳۔ (۱۷) مولانا ابوالکلام آزاد، منتخب تحریریں، مرتب انور معظم نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹۴۔ (۱۸) ایضاً، ص ۲۰۲۔

فارسی ادبیات کے فروغ میں دارالعلوم دیو بند کی خدمات

ڈاکٹر مفتی محمد شرف عالم☆

دوسری صدی ہجری میں اسلامی فتوحات کے ساتھ عربی علوم ہندوستان آئے۔ ملتان نے مدینۃ العلوم ہونے کا شرف حاصل کیا۔ دنیا کے گوشے گوشے سے علماء اس سرزمین میں وارد ہوئے اور انہوں نے یہاں علم کی روشنی پھیلائی۔ پھر غزنوی سلاطین کا عہد آیا، اس میں لاہور مرکز علم بنا، اور ساتویں صدی ہجری میں دہلی علوم وفنون کا گہوارہ بنی۔ دہلی کے فیضان سے جون پور میں علم کی مسند بچھی۔ جون پور کے فضل وکمال سے لکھنو منور ہوا۔ جہاں آفتاب علم اس آب وتاب سے چمکا کہ اس نے پورب کے ہر قصبے کو انوار علم سے جگمگا دیا۔ علمی دنیا میں بلگرام، سندیلہ، گوپامئو، خیرآباد اور بہار و بنگال کی علمی سرگرمیاں نیر تاباں کا درجہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ شاہ جہاں فخریہ لہجہ میں کہا کرتا تھا۔

پورب شیرازِ ماست (۱)

دہلی کو جس طرح اسلامی علوم وفنون کی مرکزی حیثیت حاصل تھی اور ملک کے گوشے گوشے سے تشنگان علوم اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے اس کا قصد کرتے تھے۔ اسی طرح علمائے دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے نابغۂ روزگار عالم اٹھے اور دہلی کی طرح ان کو بھی دراسات اسلامیہ میں مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ شاہ صاحب کی شخصیت اور کارنامے اظہر من الشّمس ہیں۔

۱۸۵۷ء میں پورے ہندوستان میں ایک خونی انقلاب رونما ہوا۔ اس نے دہلی کو اجاڑ دیا، اس کی سیاسی بساط الٹ گئی، اس کی علمی مرکزیت ختم ہوگئی۔ ان حالات میں علم ودانش کا کارواں وہاں سے رخت سفر باندھنے پر مجبور ہوگیا۔ اس وقت کے اہل اللہ مسلمانوں کی نعشوں کو خاک وخون میں تڑپتا ہوا دیکھ چکے تھے۔ ان کو فکر ہوئی، جس کا نتیجہ اور بخت واتفاق یا تقدیر الٰہی سے مرکزی مقام دیوبند کی

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی مانو، حیدرآباد۔

چھتہ مسجد کی شکل میں سامنے آیا۔ ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰/مئی ۱۸۶۶ء پنجشنبہ کے دن دیوبند کی سرزمین میں اسلامی علوم کی نشأۃ ثانیہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا (۲)۔ اس نے مسلمانوں کے دینی شعور بیدار رکھنے میں اہم رول ادا کیا۔ اور ملی شیرازہ ایک دینی اور علمی درس گاہ کے قیام سے باقی رہا۔

ہندوستان میں دینی تعلیم کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس سے ایک ایسا دفاعی حصار تیار ہوا۔ جس نے مسلمانوں کو روحانی اور علمی شکست سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کی روشنی برصغیر سے گذر کر افغانستان، ایران، سمرقند و بخارا، برما، انڈونیشیا، ملیشیا، ترکی اور براعظم افریقہ کے دور دراز خطوں تک پہنچی اور وہاں سے شریعت و طریقت کے طالبین یہاں جوق درجوق آنے شروع ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے علم و دانش کی کرنوں نے براعظم ایشیا کے مسلمانون کے دل و دماغ کو ایمانی نور اور اسلامی تہذیب سے منور کردیا۔ یہ دارالعلوم صرف ایک مدرسہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی تحریک ہے جس نے علم دین کی روشنی کو اہل ثروت کے عشرت کدوں سے نکال کر فاقہ مست مسلمانوں کی جھونپڑیوں تک پہنچایا اور اس نے اسلام کے خلاف اٹھنے والی ہر یورش سے پنجہ آزمائی کی (۳)۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے ساتھ ہی فارسی زبان کی تعلیم ضروری قرار دی گئی اور مستقل فارسی درجات کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں تک کہ عربی سال اول و سال دوم کے نصاب میں بھی فارسی داخل کی گئی۔ جیسے سال اول میں میزان منشعب، پنج گنج، نحو میر، شرح ماۃ عامل، و سال دوم میں علم الصیغہ اور فصول اکبری (۴) اور ہندوستان کے ہزاروں مدارس نے دارالعلوم دیوبند کے نصاب کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ یہاں دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ کر رہا ہوں، مگر اس حوالہ سے یہ بات قابل غور ہے کہ فارسی ادبیات کے فروغ میں ہزاروں مدارس حصہ لے رہے ہیں، جو کہ بالواسطہ دارالعلوم دیوبند ہی کا فیضان ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے منتسبین نے فارسی ادبیات کے فروغ میں تصنیف و تالیف، فارسی کا ترجمہ اردو میں اور عربی کا ترجمہ فارسی میں، نیز شاعری میں نظم و قصیدہ، مرثیہ و مدح لکھ کر نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کے کتب خانہ میں ایک لاکھ سے زائد کتابیں موجود ہیں، ان میں پچاس ہزار سے زیادہ کتابیں غیر درسی ہیں (۵)۔ جن میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ بہت سی قلمی کتابیں بھی ہیں، ان میں کمیاب اور نادرالوجود بھی ہیں (۶) اور فارسی کتابیں سات ہزار چار سو اڑتیس ہیں، جن میں ایک ہزار پانچ سو تریسٹھ

مخطوطات ہیں، جو مختلف علوم وفنون پر مشتمل ہیں (۷)۔ چنانچہ تعارف مخطوطات کے رجسٹر میں مولانا ظفیر الدین مفتاحی صاحب اس طرح مخطوطات کے بیان میں رقم طراز ہیں:

۱۔ فارسی تفسیری مخطوطہ ۳۷۔ ۲۔ حدیث فارسی مخطوطہ ۲۱۔ ۳۔فقہ فارسی مخطوطہ ۴۳۔ ۴۔مناظرہ فارسی مخطوطہ ۶۔ ۵۔تصوف فارسی مخطوطہ ۱۳۸۔ ۶۔صرف ونحو فارسی مخطوطہ ۲۱۔ ۷۔تاریخ فارسی مخطوطہ ۵۲۔ ۸۔ادب نظم فارسی مخطوطہ ۴۴۔ ۹۔ادب نثر فارسی مخطوطہ ۱۷۔ ۱۰۔طب فارسی مخطوطہ ۷۷۔ ۱۱۔ہیئت فارسی مخطوطہ ۹۔ ۱۲۔منطق فارسی مخطوطہ ۴۔ ۱۳۔لغات فارسی مخطوطہ ۳۰۔ (۸)

دارالعلوم دیوبند کے مؤسس وفضلاء اور خوشہ چینوں کا فارسی ادبیات کے فروغ میں قابل لحاظ حصہ ہے۔جن میں سے نمونہ کے طور پر چند کا ذکر کررہا ہوں۔قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی متوفی بہ عمر چہل ونہ (۱۲۹۷ھ-۱۸۷۹ء)(۹) نے دو درجن سے زائد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، جن میں انہوں نے اپنے زمانے کے ان مسائل پر قلم اٹھایا، جو اس وقت زیادہ زیر بحث تھے، ان کو شریعت کے مسائل کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے اور فلسفہ کے مسائل کو عقلی دلائل سے رد کرنے میں زبردست کمال حاصل تھا (۱۰)۔مولانا کی فارسی تصانیف میں اسرار قرآنی (۱۱)، مصابیح التراویح (۱۲)، استفتاء مسائل دریل (۱۳)، انتباہ المومنین (۱۴)، فیوض قاسمیہ (۱۵)، لطائف قاسمی (۱۶)، قاسم العلوم (۱۷)، انتصار الاسلام (۱۸)، تعداد رکعات تراویح (۱۹) وغیرہ ہیں۔

علامہ انور شاہ کشمیری ۱۲۹۲ھ-۱۳۵۲ھ (۲۰)، انہوں نے ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنے والد بزرگوار محمد معظم شاہ سے قرآن مجید شروع کیا، ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں کتاب اللہ کے ساتھ فارسی کی چند ابتدائی کتابیں ختم کر کے متداول علوم کے تحصیل میں مصروف ہو گئے (۲۱)۔وہ عربی وفارسی زبان سے بہت شغف رکھتے تھے۔فارسی تصانیف میں خاتمۃ الکتاب فی مسئلۃ فاتحۃ الکتاب (۲۲)، خاتم النبیین (۲۳)، بدائع منظوم (۲۴)، القطوف الدانیہ (۲۵)، قیامت نامہ (۲۶)، سلاسل طیبہ (۲۷)، اس کے علاوہ متعدد املاء کردہ مسودات ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کانپور میں تدریس کی

خدمت شروع کی، پھر حضرت امداد اللہ مہاجر مکی سے راہ سلوک طے کی، بعد میں آبائی وطن تھانہ بھون میں مستقل سکونت پذیر ہو گئے اور اعلاء کلمۃ اللہ میں اپنی پوری زندگانی وقف کر دی۔ علم و فن میں ہزار سے زائد تصانیف ورثہ میں چھوڑیں اور اصلاح و تربیت کا کام اپنے خلفاء و متوسلین کے حوالہ کر کے ۱۶؍ رجب المرجب ۱۳۶۲ھ کی شب تھانہ بھون میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے (۲۸)۔ فارسی تصانیف مکتوبات، منظومات و تزکیہ نفوس کی شکل میں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں: الفوز الکبیر مع فتح الخبیر فی اصول التفسیر از شاہ ولی اللہ بہ زبان عربی و مولانا تھانوی بہ زبان فارسی مع اضافات مفیدہ (۲۹)، مثنوی زیر و بم در احوال سیر اولیاء اور بہت سے فتاویٰ کتاب امداد الفتاویٰ میں ہیں۔

مولانا محمد یاسین ۱۲۸۲ھ۔ ۱۳۵۵ھ (۳۰)، انہوں نے فارسی ادب کی تعلیم مولانا منفعت علی استاذ دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی، فارسی زبان کے ماہر تھے (۳۱)۔ وہ فارسی کی منتہی کتابوں کا درس نہایت شوق اور کامل تحقیق سے دیتے، اس درس میں طلبہ، اہل شہر اور بعض عربی تعلیم یافتہ نیز فارغ التحصیل علماء شرکت کرتے تھے (۳۲)، اسی طرح سکندر نامہ، قصائد عرفی، بدر چاچ و سہ نثر ظہوری وغیرہ کا درس اپنی مثال آپ تھا۔ تصانیف میں: جدید صفوۃ المصادر (۳۳)، مفید نامہ (۳۴)، رسالہ نادر اور انشاء (۳۵)۔ یہ تمام کتب مدارس کے نصاب فارسی میں داخل ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء۔ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۸ء، مولانا نے فقہ و تصوف میں چودہ کتابیں تصنیف کیں، جن میں امداد السلوک (۳۶) اور الشّمس الامعۃ فی کراہۃ جماعت ثانیہ (۳۷) فارسی زبان میں ہے۔

مولانا رحیم اللہ بجنوری متوفی ۱۳۴۷ھ، کی فارسی تصانیف: جوابات الاعتراض الواردۃ الواھبۃ برائے استدلال بر معبودیت یزدان (۳۸)، تہدید المنکرین لقدرۃ رب العالمین (۳۹)، اثبات القدرۃ الالٰہیہ ہیں۔ (۴۰)

فضلائے دارالعلوم دیوبند کی دینی علوم سے متعلق ہر علم و فن میں بے شمار کتابیں ہیں جن میں بڑی اور ضخیم کتابیں ہیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابچے بھی، یہ کتابیں زیادہ تر عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ہیں (۴۱)۔ ان میں سے چند کتابوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

فارسی کا معلم، از جمیل الرحمان قاسمی پرتاب گڑھی (۴۲)، معین فارسی، از حبیب اللہ سلطان

پوری (۴۳)، میزان فارسی، از ندیم الواجدی (۴۴)، فارسی کا قاعدہ، ازعبدالرشید فتح پوری (۴۵)، جدید رہنمائے فارسی، از مزمل علی آسامی (۴۶)، آسان فارسی قواعد دو حصے، از مفتی سعید احمد پالن پوری (۴۷)، فارسی زبان کی پہلی کتاب بہ اضافات مفیدہ وترتیب جدید و فارسی کی دوسری کتاب مع جدید اسلوب اور گلہائے شگفتہ، از مفتی محمد سلیمان قاسمی (۴۸) وغیرہ۔

فضلائے دارالعلوم دیوبند کی تشریحات اور تراجم فارسی بھی کثرت سے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ معارف مثنوی، ازمولانا شاہ محمد اختر (۴۹)، کلید مثنوی، ازمولانا اشرف علی تھانوی (۵۰)، شرح انتخاب گلستاں، از محمد حسین قاسمی (۵۱)، نفحۃ الطیب فی ذکر المنزل والحبیب، از صدیق حسن فاضل دیوبند (۵۲)، بوستاں مترجم، از محمد جمیل قاسمی (۵۳)، اخلاق محسنی مترجم، از قاضی سجاد حسین قاسمی (۵۴)، تسہیل علم الصیغہ، از اصغر علی مدرس دارالعلوم دیوبند (۵۵)، قمر منیر شرح اردو نحو میر، از فرید الدین قاسمی (۵۶)، نحو میر مع تمرین، از مولانا محمد علی بجنوری (۵۷)، بہار بوستاں، وگلستاں مترجم، از فضل الرحمان قاسمی دھرم کوٹی (۵۸)، گلزار دبستاں مترجم، از کفیل الرحمان قاسمی (۵۹)، فیوض عثمانی شرح اردو فصول اکبری، از عبدالرب قاسمی (۶۰)، بہار گلستاں، از مفتی ظفر عالم دیناج پوری قاسمی (۶۱)، درے بے نظیر شرح نحو میر (۶۲)، از محمد یونس قاسمی، حاشیہ نورالایضاح فارسی اور حاشیہ نور الایضاح عربی، ازمولانا اعزاز علی، بدر منیر شرح اردو نحو میر، از عبدالرب میرٹھی وغیرہ۔

فضلائے دارالعلوم دیوبند نے فارسی زبان میں شاعری بھی کی اور ہر صنف شاعری میں داد سخن دی، جیسے نظم وقصیدہ، مرثیہ و مدح وغیرہ، شعراء میں سرفہرست مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ہیں۔ انھوں نے غزل ونظم وقصیدہ اور مدح ومرثیہ میں طبع آزمائی کی۔ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی نقوش اور بانیِ دارالعلوم دیوبند کے سلسلے میں ان کے چند اشعار یہ ہیں:

ساختی بے سر و پا بے سر و سامانی را سوختی زآتش جاں سوز مسلمانی را
مرشد و ہادی شاہ محمد قاسم رہنمائندہ گم راہ محمد قاسم
با دل روشن و آگاہ محمد قاسم رفت زیں دار فنا آہ محمد قاسم
حالیہ زیستم مشکل و مردن مشکل ہائے آں لطف وعنایات کجا باشد ہیہات
ہائے آں حسن اشارات کجا باشد ہیہات ہائے آں رمز و حکایات کجا باشد ہیہات
ہائے آں شارح آیات کجا باشد ہیہات

ایک اور شاعر مفتی محمود الحسن صاحب نے اپنے ایک شعر میں حضرت مولانا یعقوب صاحب اولین شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے درس بخاری کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

باب اول از بخاری درس داد ان خوش نظام ذات و صفش ہست طیب نائب خیر الانام

سید محبوب رضوی کا عظیم شاہکار تاریخ دارالعلوم دیوبند ہے۔انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی مدح میں ۱۷۸ راشعار پر مشتمل نظم لکھی ان میں سے چند اشعار یہ ہیں:

نسبت قاسمی احسنت کہ ہنگامہ دیں ازتو گرم است بدوران چہ دفاع و چہ ہجوم
نسبت قاسمی اکرمت کہ ایں دین فطرت ازتو پیدا است بہر کس چہ عدول و چہ ظلوم
نسبت قاسمی انعمت کہ ایں نعمت کل از تو حاوی است بر آفاق باندازِ عموم
نسبت قاسمی اعدلت کہ عدل اسلام بری از فرط و فرط گشتہ ز تو شد معلوم
نسبت قاسمی افضلت کہ فیضان غیوب بر تو شد شاہد و مشہود ز غیب مکتوم
نسبت علم و عمل نسبت عشق و احوال نسبت فقہ دروں نسبت اسرار علوم
ایں کہ رنگیست حکیمانہ دین اسلام قاسم العلوم بنا کردہ بریں دارالعلوم(۶۳)

عبدالکریم فروغ نے ۱۲۹۶ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، پھر جودھپور چلے گئے۔ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں متھرا میں وفات پائی، اردو فارسی ادبیات میں بہت شہرت حاصل کی، ان کے کلام میں شگفتگی، بے ساختگی و پختگی پائی جاتی ہے، مولانا یعقوب نانوتوی کی مدح میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مولی یعقوب فخر اولیاء عارف حق جانشین مصطفے
رونق دین چشمہ دین و عمل بے نظیر و بے عدیل و بے بدل
متقی و صاحب قلب سلیم کہ آن حلم و معدن خلق عظیم
شیخ عالم مقتدا و پیش وا روز و شب مصروف طاعات خدا
اتباع سنت و اعمال و علم اتقاء و طاعت و اخلاق و حلم(۶۴)

عبدالکریم فروغ کے اشعار مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا رفیع الدین صاحب کی مدح میں اردو وفارسی الفاظ کے امتزاج کے ساتھ بھی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

مہتمم بھی اس کے ہیں خوش انتظام مولوی صاحب رفیع الدین نام
صاحب عقل و تدابیر متین خیر خواہ دین ختم المرسلین(۶۵)

حوالہ جات

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص ۷۷، سید محبوب رضوی، ادارہ اہتمام دارالعلوم دیوبند، ۱۹۹۲ء۔(۲) مولانا محمد قاسم نانوتوی، حیات اور کارنامے،ص ۱۲۹، مولانا اسیر ادروی، شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند، ۲۰۱۳ء۔(۳) ایضاً،ص ۳۰۸۔(۴) دارالعلوم دیوبند کی صدسالہ زندگی، قاری محمد طیب، دفتر اہتمام، دارالعلوم دیوبند، ۱۳۸۵ھ۔(۵) تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص ۳۲۵، ج ۲۔(۶) حوالہ مذکور۔(۷) تعارف مخطوطات کتب خانہ دارالعلوم، مرتب مولانا ظفیر الدین مفتاحی،ص ۱ تا ۲۰، پرنٹنگ پریس دیوبند، ۱۹۷۰ء۔(۸) رجسٹر فارسی تصانیف، ج ۱۔(۹) مولانا محمد قاسم نانوتوی، حیات اور کارنامے،ص ۲۲۵۔(۱۰) تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص ۶۰، ج ۱۔(۱۱) مطبع یوسفین پریس میرٹھ، ۱۳۲۱ھ۔(۱۲) مطبع چغتائی میرٹھ، ۱۲۹۰ھ۔(۱۳) مطبع مجتبائی میرٹھ، ۱۲۹۱ھ۔(۱۴) ایضاً، ۱۳۰۹ھ۔(۱۵) مطبع بلال، سارھوڑہ، ۱۳۰۴ھ۔(۱۶) مطبع مجتبائی میرٹھ، ۱۳۰۹ھ۔(۱۷) ایضاً۔(۱۸) ایضاً، ۱۳۰۲ھ۔(۱۹) دارالعلوم اور دیوبند کی چند تاریخی شخصیات،ص ۱۰۱، خورشید حسن، تفسیر القرآن دیوبند۔(۲۰) حوالہ سابق،ص ۲۸۔(۲۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص ۴۷، ج ۱۔(۲۲) تجلی پریس، ۱۳۳۰ھ۔(۲۳) مطبع مدینہ بجنور، ۱۳۵۳ھ۔(۲۴) رشید المطابع سہارنپور، ۱۳۰۰ھ اور ۱۳۰۴ھ۔(۲۵) حوالہ سابق، ۱۸۲۶ء۔(۲۶) مطبع شمس المطابع، مرادآباد، ۱۳۵۸ھ۔(۲۷) مطبع محبوب المطابع، دہلی ۱۳۵۸ھ۔(۲۸) دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات،ص ۳۴، قاری محمد طیب، دار الاشاعت دیوبند، ۱۳۸۵ھ۔(۲۹) مطبع مجتبائی میرٹھ، ۱۳۱۶ھ۔(۳۰) دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات،ص ۱۳۰۔(۳۱) حوالہ سابق،ص ۱۳۱۔(۳۲) دارالعلوم اور دیوبند کی چند تاریخی شخصیات،ص ۱۱۔(۳۳) مکتبہ رحیمیہ، ۱۳۲۵ھ۔(۳۴) حوالہ سابق، ۱۳۳۰ھ۔(۳۵) دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات،ص ۶۰۔(۳۶) رجسٹر مخطوطات فارسی، کتب خانہ دارالعلوم دیوبند۔(۳۷) مطبع مجتبائی میرٹھ، ۱۲۹۰ھ۔(۳۸) مطبع قاسمی دیوبند، ۱۳۳۷ھ۔(۳۹) حوالہ سابق۔(۴۰) مطبع شرف العلوم، بجنور، ۱۳۸۱ھ۔(۴۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص ۲۲۵، ج ۱۔(۴۲) مجلس علمی کٹر میدین گنج پرتاب گڑھ، ۱۴۱۳ھ۔(۴۳) کتب خانہ محمودیہ، دیوبند۔(۴۴) یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند۔(۴۵) فاروقیہ بک ڈپو۔(۴۶) مختار بک ڈپو، دیوبند۔(۴۷) مکتبہ حجاز، دیوبند۔(۴۸) مکتبہ حمیدیہ خوشحال پور، ڈاک خانہ مرزاپور، سہارن پور، ۱۴۲۶ھ۔(۴۹) مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، ۱۹۹۶ء۔(۵۰) مکتبہ رحیمیہ، ۱۹۷۰ء۔(۵۱) یونائیٹڈ پریس، ۱۳۹۰ھ۔(۵۲) مطبع مفید عام، اکبرآباد، ۱۴۹۹ھ۔(۵۳) مطبع تیج کمار لکھنو، ۱۹۶۲ء۔(۵۴) مطبع کا نام مذکور نہیں ہے، ۱۳۸۴ھ۔(۵۵) یاسر ندیم دیوبند، ۲۰۰۵ء، سال کتابت ۱۹۵۰ء کتاب پر ہے۔(۵۶) مکتبہ نعیمیہ، دیوبند۔(۵۷) مکتبہ دیوبند، ۱۴۲۵۔(۵۸) دارالکتاب، دیوبند، ۱۹۹۵ء۔(۵۹) حوالہ سابق، ۱۹۹۹ء۔(۶۰) مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، ۱۹۹۰ء۔(۶۱) دارالکتاب، دیوبند، ۱۹۹۹ء۔(۶۲) مکتبہ البلاغ، ۱۴۲۸ھ۔(۶۳) تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص ۲۶-۲۷۔(۶۴) حوالہ سابق،ص ۴۳۶، ج ۲۔(۶۵) ایضاً،ص ۴۳۷۔

اخبار علمیہ

’’دنیا کا سب سے بڑا نسخہ قرآن مجید‘‘

قرآن مجید اب تک کاغذ، کپڑے اور چمڑے وغیرہ پر لکھا اور تیار کیا جاتا رہا ہے لیکن ایک خبر کے مطابق پاکستان سے تعلق رکھنے والے شاہد رسام نے دنیا کا سب سے بڑا قرآن کراچی میں تیار کیا ہے۔ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں المونیم اور سونے سے لکھا گیا یہ دنیا کا پہلا قرآن ہے۔ فریم کے سائز سے قطع نظر قرآن پاک ۸ء۵ فٹ لمبا اور ۶ء۵ فٹ چوڑا ہے۔ ایک صفحہ پر ۱۵۰ الفاظ درج ہیں۔ جبکہ کل صفحات ۵۶۰ ہیں۔ اس سے قبل شاہد رسام نے ۲۰۰۰ء میں المونیم اور سونے سے ’’اللہ‘‘ کے ۹۹ نام تیار کر کے متحدہ عرب امارات کی العین یونیورسٹی سے آرٹسٹ آف دی ایر ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق قرآن پاک کا یہ نسخہ اگلے ماہ دبئی میں ہونے والے ’’دبئی ایکسپو ۲۰۲۰‘‘ میں پیش کیا جائے گا۔ (اعتماد، حیدرآباد، ۲؍ستمبر ۲۱ء، ص ۴)

’’رامائن کی انوکھی پیش کش‘‘

حال ہی میں وانی پبلی کیشن نئی دہلی نے ’’رامائن۔ یک قافیہ (منظومۂ افق)‘‘ کی دوبارہ اشاعت کی ہے۔ ملک الشعرا دوارکا پرساد ’’افق‘‘ لکھنوی کی اردو میں تحریر کردہ اس رامائن کا ادبی دنیا میں خاص مقام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رام نے ہر زمانے میں ہر علاقہ بالخصوص برصغیر پاک و ہند کے شعرا و ادبا اور مصنّفین کو اپنے کردار سے متاثر کیا ہے اور یہ روایت آج بھی جاری ہے۔ شاعر نے والمیکی اور رام چرت مانس سے متاثر ہو کر اس کو اس طرح اپنے اشعار میں ڈھالا ہے کہ ترجمہ کے بجائے اس پر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ پوری رام کہانی کو ۳۲ جلی عناوین کے تحت قلم بند کیا گیا ہے۔ مثنوی اسلوب میں لکھی گئی اس کتاب میں ۱۲ سو اشعار ہیں۔ اس کا آغاز ایشور کی حمد و ثنا سے ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے رام کہانی کے کرداروں کی اہمیت خاص طور پر اجاگر کی ہے۔ کلاسیکل اردو میں مرقوم اس رامائن میں پرانوں سے متعلق متعدد عقائد و اوہام اور سربستہ سرگذشتوں کو شامل کیا گیا ہے۔ شاعر نے اس کے ذریعہ دو اہم زبانوں ہندی اور اردو میں لسانی روابط کی جانب اشارے کیے ہیں اور ساتھ ہی دونوں فرقوں کے درمیان اخوت و بھائی چارگی کو فروغ دینے کی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس کے

مرتب ڈاکٹر کومل بھٹناگر ہیں۔ قیمت ۸۹۵ ہے۔ (ہندوستان، وارانسی (ہندی)، ص ۱۳، ۱۱/ ۹/ ۲۱ء)

”مرّیخ کے حجری و خاکی نمونے“

چند ہفتے قبل ناسا کے خلائی جہاز پر یز رورنس نے مرّیخ کے ایک پتھر پر زور آزمائی کی تھی جس میں ناکامی ہوئی تھی لیکن اب خبر ہے کہ اس نے وہاں کی ایک سخت چٹان پر گول سوراخ کر کے وہاں سے پتھر اور مٹی کا نمونہ حاصل کیا ہے۔ اس یافت کو ماہرین نے ایک بہت بڑی کامیابی قرار دیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ایک روز یہ نمونہ مریخ کی ارضی کیمیائی ترکیب اور خود وہاں موجود خرد نامیوں کا جائزہ لینے کے لیے زمین پر لایا جائے گا۔ اس تحقیق سے وابستہ ناسا کے ذمہ داروں نے بتایا کہ یکم ستمبر کو مریخی تحقیقی گاڑی نے اپنی برما مشین سے ایک پتھر پر سوراخ کر کے اس کا ٹکڑا نکالا ہے۔ جس بڑے پتھر سے اس کا ٹکڑا نکالا گیا ہے وہ ہموار چٹان ہے جسے روشیٹ کا نام دیا گیا ہے۔ ڈرلنگ یعنی سوراخ کرنے کے مکمل عمل کی تصویر بھی ناسا کو موصول ہوئی ہے۔ روور نے سوراخ کے اندر کا منظر جو بالکل واضح اور گول ہے بھیجا ہے۔ ایک ٹیوب میں موٹائی میں عام پنسل جیسا یہ پتھر مریخی جہاز کے اندر جمع کیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ اس نمونہ کو زمین پر لانے کا کوئی نظام ابھی سامنے نہیں لایا جا سکا ہے اس لیے فی الحال یہ اسی جہاز میں ہے۔ آیندہ چند برس بعد ممکن ہے یہ پتھر مریخی میدان میں اگل دیا جائے جسے کسی اور خلائی جہاز سے اچک کر زمین پر لایا جائے۔ پر یز رورنس میں ایک چھوٹی تجربہ گاہ ضرور ہے مگر وہ اس پتھر کی تحقیق کے لیے کافی نہیں ہے۔ (تاثیر، پٹنہ، ۹/ ستمبر ۲۱ء، ص ۷)

”اقلیتی اسکولوں کے متعلق ایک چشم کشا سروے“

بچوں کے حقوق سے متعلق ایک ادارہ این سی پی سی آر نے ملک میں مسلم اقلیتی اسکولوں کے متعلق اپنی ایک تحقیقی رپورٹ میں کہا ہے کہ یہ جملہ اقلیتی اسکولوں کا ۲۲٫۷۵ ہیں۔ عیسائیوں کے ادارے جملہ مذہبی اقلیتی اسکولوں میں ۷۱٫۹۶ فیصد ہیں۔ رپورٹ کا مقصد اقلیتی طبقات کے بچوں کو معیاری ابتدائی تعلیم کے حصول کے لیے امکانات اور راہوں کو تلاش کرنا ہے۔ تمام طبقات میں طلبہ کا ۶۲٫۵۰ فیصد حصہ غیر اقلیتی طبقہ کا ہے۔ جبکہ ۳۷٫۵۰ فیصد طلبہ کا تعلق اقلیتی طبقات سے ہے۔ جملہ مذہبی اقلیتی آبادی میں سکھوں کا تعاون ۹٫۷ اور مذہبی اقلیتی اسکولوں میں ان کا حصہ ۱٫۵۴ فیصد ہے۔

جملہ مذہبی آزادی کا ۸ء۳ ۳فیصد بودھ طبقہ جملہ مذہبی اقلیتی اسکولوں میں ۸ ۴ء۰ فیصد کی حصہ داری رکھتا ہے۔جین کی اقلیتی آبادی میں ۹۰ء۱ فیصد حصہ داری ہے اور مذہبی اقلیتی اسکول میں ان کا تناسب ۵۶ء۱ فیصد ہے۔ پارسی جملہ مذہبی آبادی ۰۳ء۰ فیصد ہیں لیکن جملہ اقلیتی اسکولوں میں ان کا تناسب ۳۸ء۰ فیصد ہے۔اس جائزہ میں ہندوستان میں آباد تمام اقلیتی طبقات اپنی آبادی کے لحاظ سے بہتری کی طرف گامزن نظر آتے ہیں۔ مسلمان ان اقلیتوں میں سب سے بڑی اکثریت ہے لیکن اقلیتی اسکولوں میں ان کے صرف ۲۲ فیصد ادارے ہیں۔کیا مسلمان اب بھی اپنی مذہبی و تعلیمی حالت کی جانب توجہ نہیں دیں گے؟ (اعتماد،حیدرآباد،ص ا، ۱۱/اگست ۲۱ء)

"ڈاکٹر عارف نوشاہی عالمی ایوارڈ سے سرفراز"

ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب کا تعلق اسلام آباد سے ہے۔فارسی زبان و ادب بالخصوص فارسی مخطوطات پر ان کی دسترس اور گہری نظر کا معترف تو ایک پورا جہان ہے۔قارئین معارف ان کے قلمی تعاون سے بخوبی آشنا ہیں۔ان کے متعلق یہ خبر دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ حکومت ایران نے انہیں ان کی ایران شناسی کی مجموعی خدمات پر بارہویں بین الاقوامی جشنوارہ فارابی (منعقدہ ۱۸/ جولائی ۲۰۲۱ء)،تہران میں غیر ملکی محققین کے زمرہ میں بہترین محقق قرار دیا ہے۔ان خدمات کے اعتراف میں انہیں نشان فارابی کے علاوہ تین اسناد اعزاز سے بھی نوازا گیا ہے۔ایک سند صدر جمہوریہ اسلامی ایران حسن روحانی کے دستخط کے ساتھ ہے۔دوسری سند ایران میں اقوام متحدہ کے ثقافتی ادارہ یونیسکو کی مقامی شاخ اور تیسری سند اسلامی ممالک کی عالمی تنظیم ایسسکو کی مقامی شاخ کی طرف سے ہے۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر عارف نوشاہی کی حالیہ معروف کتابوں میں "برصغیر میں مطبوعہ فارسی کتب کی کتابیات" اور "پاکستان میں فارسی مخطوطات کی فہرست" چار چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ہمارے لیے یہ خبر اس لیے اہم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریریں گذشتہ چند برسوں میں معارف کے ایک اہم باب "باب التقریظ والانتقاد" کی زینت بنتی رہی ہیں۔ (یہ اطلاع خود ڈاکٹر صاحب نے اخبار علمیہ کے لیے فراہم کی ہے)

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مکتوب اعظم گڑھ

شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ
۲۵؍ستمبر ۲۰۱۲ء

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف اگست ۲۰۲۱ء کے شمارہ میں صفحہ ۱۲۳ پر ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی صاحب کا تحقیقی مضمون ''اسلامی معاشیات: مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کی نظر میں'' شائع ہوا ہے، جس میں موصوف کو معاشیات کی جدید تعریف اور اس کے پیش کنندگان کے ضمن میں کچھ تسامح ہوا ہے:

۱۔ صفحہ ۱۲۴ پر انہوں نے لکھا ہے ''غیر مسلم مفکرین میں آدم اسمتھ (م ۱۷۹۰ء) جن کو اکنامکس کا بانی کہا جاتا ہے، انہوں نے اور الفریڈ مارشل (م ۱۸۴۲ء) نے معاشیات کی تعریف یوں بیان کی ہے:

"Economics is a science which studies human behaviour as a relationship between ends and scare means with alternative uses".

معاشیات کی مذکورہ بالا تعریف نہ آدم اسمتھ کی ہے اور نہ الفریڈ مارشل کی بلکہ ان کے بجائے مشہور ماہر معاشیات لیونل رابنس (م ۱۹۸۴ء) کی ہے جو عرف عام میں معاشیات کو "science of choice" یا "choice under scarcity" کے نام سے متعارف کرواتے ہیں جس کی رو سے محدود وسائل اور لامحدود مادی ضروریات کے درمیان انتخاب کا مسئلہ ہر انسان کو درپیش ہوتا ہے۔ جبکہ آدم اسمتھ (م ۱۷۹۰ء) کی تعریف wealth of nations یا دولت کی کھوج بین کے نام سے کرتے ہیں اور الفریڈ مارشل (م ۱۹۲۴ء؛ ان کا سال وفات ۱۸۴۲ء غلط لکھا ہے، ۱۸۴۲ء مارشل کی پیدائش کا سال ہے) نے معاشیات کو انسانی طرز عمل (human behaviour) اور سماجی فلاح (social welfare) کے پیرائے میں متعارف کروایا ہے۔ تینوں ماہرین نے علم معاشیات کی تین الگ الگ جہات متعین کی ہیں، ان کو ایک ساتھ رکھنا، یا ہم معنی سمجھنا حقائق سے پرے ہے۔

۲۔ اسی صفحہ پر موصوف نے مالیات کو معاشیات کا ہم معنی بتایا ہے۔ موجودہ تخصیصی علوم کے دور میں مالیات اور معاشیات ہم معنی تو دور ایک دوسرے کے متبادل بھی نہیں رہ گئے، بلکہ دو بالکل مختلف مضامین ہیں، دونوں کے ماہرین الگ ہوتے ہیں اور دونوں کے عملی میدان بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں، معاشیات اور اقتصادیات ایک دوسرے کی ہم معنی اصطلاحات ہیں لیکن مالیات معاشیات کا ہم معنی نہیں ہوسکتا۔ مال اور مالی امور کے تعلق سے ایک عمدہ روایتی تشریح انہوں نے کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مال معاشیات کا ایک حصہ تو ہوسکتا ہے لیکن ہم معنی نہیں۔ قدیم اور وسطیٰ زمانے تک جب معاشیات کے مسائل وعلوم نہایت محدود تھے اس وقت تک مال اور مالی معاملات کو معاشیات کا ایک جز تصور کیا جاتا تھا لیکن اب نہیں۔

والسلام

(ڈاکٹر) محمد خالد
(استاد شعبہ معاشیات)

ادبیات

نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

جناب وارث ریاضی☆

انھی کو سرورِ عالم ، شہہِ دنیا و دیں کہیے
انھی کو داعیِ دینِ خداے آفریں کہیے

امام الانبیا کہیے ، شفیع المذنبیں کہیے
انھی کو ہادیِ حق ، صادق الوعد و امیں کہیے

نوازا تھا خدا نے جن کو اعزازِ نبوت سے
انھی کی مغتنم ہستی کو ختم المرسلیں کہیے

وہ جن کے دم سے حکمت کا جہاں میں بول بالا ہے
انھی کی ذات کو سرچشمۂ علم و یقیں کہیے

فلک پر ماہ وانجم ضوفشاں ہیں ان کے جلووں سے
انھی کو آسمانِ حسن کا شمسِ مبیں کہیے

وہ جو دنیا کے سارے بے سہاروں کا سہارا تھے
انھی کو خیرِ خلق و رحمۃ العالمیں کہیے

وہ جن کی ذات پر قرآن کو نازل کیا حق نے
انھی کو کاشفِ اسرارِ قرآنِ متیں کہیے

کیا اللہ نے جن کو مشرف دید سے اپنی
انھی کی شخصیت کو واصلِ عرش بریں کہیے

دلِ انساں کو سوزِ دل سے گرمایا ہے جنھوں نے
انھی کے سوزِ دل کو روحِ ایمان و یقیں کہیے

وہی سب سے مقرب ہیں خدا کے، ساری دنیا میں
جو ان سے قرب رکھتا ہے، اسے رب کے قریں کہیے

انھی کی پیروی میں ہے نہاں امن واماں وارث
انھی کی پیروی کو حاصلِ دنیا و دیں کہیے

نعت

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی☆☆

اُدھر انؐ کے رخِ پُرنور کا دیدار ہوجانا
اِدھر دنیاے دل کا مخزنِ انوار ہوجانا

اگر مطلوب ہے اے دل، دو عالم میں سرافرازی
نثارِ نقشِ پاے سیدِ ابرار ہوجانا

ہٹا سکتا نہیں کوئی مجھے آقاؐ کے رستے سے
مجھے آتا نہیں ہے ہمرہِ اغیار ہوجانا

☆ کاشانۂ ادب سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن بہار۔ ☆☆ گوشۂ مطالعات فارسی، علی گڑھ۔

یہی پہچان ہے دونوں جہاں کے خوش نصیبوں کی
اطاعت آپؐ کی ، اغیار سے بیزار ہوجانا
بتاؤں کیا میں تم کو مرتبے انؐ کے غلاموں کے
بہائے دو جہاں ہے ، پیروِ سرکارؐ ہوجانا
نہ تھے واقف جو اخلاق واخوت کے تقاضوں سے
سکھایا آپؐ نے ان کو بھی خوش اطوار ہوجانا
نبیؐ کے ساتھیوں سے سیکھ لو ، آداب جینے کے
کہیں پر پھول بن جانا ، کہیں تلوار ہوجانا
تعالی اللہ ، قسمت حضرتِ صدیقِ اکبرؓ کی
نصیب ان کو ہوا آقاؐ کا یارِ غار ہوجانا
بھلا سکتا ہے ہیبت کیا کوئی فاروقِ اعظمؓ کی
وہ ان کو دیکھ کر شیطاں کا بھی فرّار ہوجانا
شہادت حضرتِ عثماںؓ کی پُردرد تھی کتنی
گلوے بے خطا ، اور خون کا فوّار ہوجانا
شجاعت کے علیؓ کی معترف سب اہل ایماں ہیں
زبان زد ہے جہاں میں حیدرِ کرار ہوجانا
پلٹ آئے رئیس آقاؐ کی طاعت کی طرف فوراً
نہ چاہے جو زمانے میں ذلیل و خوار ہوجانا

یہ کس پردہ نشیں کی سارے منظر بات کرتے ہیں

جناب ابوذر انصاری ☆

کہیں گلشن کہیں مہتاب و نیر بات کرتے ہیں
یہ کس پردہ نشیں کی سارے منظر بات کرتے ہیں
نہ مجلس ہی کے لمحے چپ نہ تنہائی کے لمحے ہی
حیات طیبہؐ کے سارے دفتر بات کرتے ہیں
وہؐ جب خاموش ہوتے ہیں متانت ناز کرتی ہے
لبوںؐ سے پھول جھڑتے ہیں جو سرورؐ بات کرتے ہیں
جو کہہ دیں وہؐ فلک کا چاند بھی دو پھاٹ ہوجائے
اشارہ کردیں تو مٹھی کے کنکر بات کرتے ہیں
شہنشاہ دو عالمؐ ہیں مگر کیا انکساری ہے
یہ حجرے کی چٹائی اور بستر بات کرتے ہیں
ضعیفوں کے یتیموں کے دلوں کی پاسداری ہو
یہ وہ اقدار ہیں جن کی پیمبرؐ بات کرتے ہیں
موذن کی صدا ہو یا کہ تسبیح و تلاوت ہوں
عمرؓ کی برسرِ محراب و منبر بات کرتے ہیں

☆ جونپور۔

جو یکسوئی ہے فتنوں سے یہ بھی احسانِ عثماں ہے مسائل قرأتِ قرآں کے اکثر بات کرتے ہیں

نکل آتا ہے کیونکر ذکر اس صورت میں تیرا بھی
کہ جب ہم اہل نسبت کی ابوذر بات کرتے ہیں

قطعۂ تاریخ رحلت

شیرِ پنجاب امیر مجلس احرارِ اسلام

(مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی)

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی ☆

شیرِ پنجاب حبیبِ رحمان دیروز زین دار محن برفت سوی دارِ قرار

دیدم خبرش بہ روزنامہ امروز کردم برای وی و خودم استغفار

وی را بہ بھشت و امن و عیش و عشرت ما را بَدَلَش دھد خدای غفار

جسیتم چو سال رحلتش ز روی اعداد دیدیم کہ نیست چون رموز و اسرار

صد و دہم سیزدہ افزودہ نوشتیم رئیس

۱۱۳

سالِ خوتش ”رحلتِ امیر الاحرار“

۱۳۳۰

۱۱۳

۱۴۴۳ھ / (۲۰۲۱ء)

☆ گوشۂ مطالعات فارسی، علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ: از ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، مرتبہ ڈاکٹر رفعت سلطان، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۵۶۰، قیمت ۲۶۰ روپے، پتہ: باب العلم پبلی کیشنز، شبستان اپارٹمنٹ، دوسری منزل، سید فتح علی اسٹریٹ، عیدگاہ ہلز، بھوپال-۱۔

بغداد ہند بھوپال کی علمی، مذہبی، ادبی اور شعری کائنات میں خدا جانے کتنے فلک اور کتنے برج سمائے ہوئے ہیں، چھوٹی عمر کی چھوٹی سی ریاست کو علم کی دنیا میں بغداد سے تشبیہ دیا جانا، بجائے خود بڑا اعزاز واعتراف ہے، تاہم جیسی اس کی تاریخ کی ضرورت ہے، اب تک اس کا انتظار ہے، زیر نظر کتاب غالباً اس ضرورت کا اولین حصہ ہے، بہت پہلے ۶۵ء میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی اور پہلی بار ریاست بھوپال کی علمی وادبی تاریخ جو اصلاً اردو زبان ہی کی داستان ہے، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے نہایت سلیقہ سے بیان کی تھی، ۲۰۱۴ء میں گویا نصف صدی کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، جس پر مشہور مصنفہ وادیبہ ڈاکٹر رضیہ حامد نے ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر کتاب کی اہمیت کا احیاء کر دیا۔ نو ابواب میں بھوپال کے تاریخی وتمدنی پس منظر کے بعد جس طرح اردو ادب کے آغاز و ارتقا کو پیش کیا گیا وہ واقعی نصف صدی پہلے کے محققین کی محنت وجستجو کا پتہ دیتا ہے، علمی خدمات کے تعارف میں بھوپال اور بھوپالیوں کے نازک فرق کو جس طرح ملحوظ رکھا گیا وہ بھی داد کے لائق ہے، ایک شاعر سید محمود اعظم فہمی بھوپالی تھے، ان کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک تحریر کا اقتباس ہے جس میں سید صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ ''فہمی، انواع کلام، موضوعات شعری اور مذاق سخن کے لحاظ سے حالی سے مناسبت قریبی رکھتے ہیں، وہ نہایت متواضع اور خاکسار ہیں اور یہ وہ حقیقت ہے جو تلامیذ الرحمان کو کم ملا کرتی ہے، دوسری صفت یہ ہے کہ ان کو اپنے فرزندان معنوی سے بے جا محبت نہیں ہے، میں نے ان کو اپنے ہاتھوں سے اپنے فرزندان معنوی کو بے تامل قطع وبرید کرتے دیکھا ہے، انہوں نے اس کو اچھا سمجھا سب نے جس کو اچھا سمجھا'' سید صاحب کی اس تحریر کا حوالہ (جادہ اپریل ۱۹۴۹ء، سخن فہمی) سے دیا گیا، کاش کوئی دلدادہ تحقیق اٹھتا اور سید صاحب اور دیگر مشاہیر کی ایسی تحریروں کو پیش کر دیتا۔ یہ کتاب ایسے حوصلہ مندوں کے لیے بھی بہترین رہنما اشاریہ ہے، ۶۵ء تک بھوپال کی فضاؤں میں اردو کا پرچم لہرا رہا تھا لیکن اب کیا حال ہے، ڈاکٹر رضیہ حامد نے ایک ضمیمہ میں اس کی جھلک پیش کر دی ہے، اگرچہ اس میں رجائیت کا پہلو نمایاں ہے لیکن حقیقت، مایوسی کی جانب اشارہ کرتی جاتی ہے، اسلاف کے قصے یا کارنامے، زندگی نو عطا کرنے میں معاون ہوتے رہے ہیں، خدا کرے اس کتاب کے تازہ مطالعہ سے کچھ نئی زندگی کا احساس ہو۔

جبل پور میں اردو ۱۹۵۶ء تک: از جناب فیروز کمال، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع

گرد پوش، صفحات ۳۲۰، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: جناب اشفاق کمال، کمال کمپیوٹرس گوہل پور، جبل پور ۴۸۲۰۰۲، ایم پی۔

بھوپال کی طرح جبل پور بھی وسط ہند کا خوبصورت شہر ہے، اس کی گنگا جمنی شناخت، نام ہی سے ظاہر ہے، جبل پور کی اردو تاریخ گو زیادہ پر ثروت نہیں، لیکن آج بھی اس کی وادیوں میں سلیم انصاری، محمود شیخ اور خود زیر نظر کتاب کے مولف جیسے اہل قلم اردو کے گلشن کی آبیاری میں مصروف ہیں، فیروز کمال کے کمال فکر نے ان کو دوسرے علاقوں کی اردو تاریخ کی طرح اس خطہ کی خدمات اردو کو پیش کرنے پر آمادہ کیا اور پھر یہ کہنے کا حوصلہ دیا کہ

اب آنے والے کریں اس پہ قصر نو کی تعمیر وفا و مہر کی بنیاد ہم تو ڈال چکے

اس بنیاد گزاری میں خون جگر کی نمود صاف دیکھی جاسکتی ہے، جبل پور کی تاریخ، اردو کے ارتقائی مراحل، ادبی ماحول کے ساتھ سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں کے حالات اور نمونہ کلام کو بڑی محنت سے جمع کیا گیا، متعدد شعراء کی تصویریں بھی حاصل کی گئیں، اس طرح قریب دوسو سال کی تاریخ ہر ممکن ماخذ و مصدر کی مدد سے مرتب کردی گئی، لائق مصنف کا وعدہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کے بعد کی ادبی تاریخ بھی شائع ہوگی، دوسروں کی طرح ہم کو بھی اس کا انتظار ہے۔

نعتیں (مجموعہ نعت): از جناب رباب رشیدی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۶۴، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: رباب رشیدی صاحب، ۱۲۶، تازی خانہ، پوسٹ آفس امین آباد، لکھنؤ۔۱۸/ اور دانش محل، لکھنؤ۔

جناب رباب رشیدی، اردو کے نہایت قابل احترام سخن گو بلکہ دور حاضر میں قدیم اساتذۂ فن کی طرح، فن شاعری پر عبور کامل رکھنے والے معدودے چند اکابر میں شامل ہیں، ان کی شاعری ہمیشہ ہی شرافت لفظ و معنی کا احساس دلاتی رہی، غزل اور رباعی میں ان کا سرمایہ، اردو کی پر ثروت روایت کا حصہ ہے، لیکن ان کی شاعری کو جس نے تقدیس سے ہم آہنگ کیا وہ ان کا حمدیہ و نعتیہ کلام ہے، ان کے رباعیات کے مجموعہ میں ایک رباعی ان کے جذبات کی پاکیزگی کی عجب ترجمان ہے:

الفاظ نہ تخیل نہ اعجاز بیاں افکار نہ انداز نہ تاثیر زباں
کچھ لطف ہی دیتے نہیں آقا کے حضور ہاں اشک رواں، اشک رواں، اشک رواں

زیر نظر مجموعہ نعت میں بس یہی جذبے ہیں اور وہی کیفیتیں ہیں، جن کی لہریں، شاعر کو ادھر لے جاتی ہیں جہاں وہ جانا چاہتی ہیں، طویل بحروں میں نعتوں کو جس طرح سجایا گیا، اہل نظر نے اس کو "ان ہی کا حصہ" بتایا

ان کے الطاف و اکرام کو دیکھ کر زندگی پائے اطہر سے لپٹی ہوئی
کہہ رہی ہے کہ میرا وجود آپ سے اور میری بقا میرے سرکار ہیں

لیکن چھوٹی بحریں بھی کیا کم ہیں

مدحت خیر الانام لفظ و بیاں ناتمام
حرمت آقا پہ بات پھر تو ہے جینا حرام
لفظ جو ان کے لب سے چھو جائے انتہائے ثبات تک آئے
یہی فیضان نعت گوئی ہے ہم جو ان کیفیات تک آئے

شاعر کا تعلق لکھنؤ سے ہے یعنی بالفاظ دیگر متواضع و منکسر مزاج سے ہے، شاید اسی لیے لکھ دیا کہ نعتوں کے سلسلے میں کوئی خاص نظم وضبط نہیں ہوسکا، اگر کوئی منفرد رنگ ہے تو اس میں شاعر کی کسی کدوکاوش کا دخل نہیں، حمد ونعت گوئی کے لیے شرط اول یہی جذبہ عبودیت وعقیدت ہے، تقدس بھی اسی سے اور تاثر بھی اسی سے۔ یہ مجموعہ تسکین دل کا ضامن ہے، اس لیے ہر صاحب دل کے ہاتھوں اور نگاہوں میں اسے ہونا ہی چاہیے۔

ارتعاش: از جناب رہبر تابانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۲۴، قیمت ۲۵۰ روپے، پتے: رہبر تابانی صاحب، محلہ چھپی، دریاباد، بارہ بنکی اور جناب صغیر نوری جنرل سکریٹری، عاجز ماتوی اکادمی، بارہ بنکی اور بزم الفقر بارہ بنکی۔

غزلوں کے اس ارتعاش انگیز مجموعہ کے متعلق ایک صاحب ذوق جناب واصف فاروقی نے شاعر کے شعری نسب نامہ کا ذکر کیا، یہ جدت ہے تو خوب ہے کہ مومن، نسیم، تسلیم، حسرت، شفیق، تاباں شفیقی کے بلند ترین سلسلہ کی روایتوں کے امین جناب رہبر تابانی ہیں، ان کی شہرت نہایت مشاق، پختہ گو اور استاذ شاعر کی ہے، کئی مجموعے پہلے بھی آچکے ہیں اور ان میں بعض کا ذکر ان سطروں میں کیا گیا ہے، رہبر صاحب جس فضا میں گنگناتے ہیں، یقیناً ہر شاعر کے کلام کی طرح یہ بھی ایک قسم کی مخصوص فضا ہے، اب جن لوگوں نے ان کو شروع اور قریب سے دیکھنے کی توفیق پائی، ان ہی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ داخلی کیفیات ان حالات کا نتیجہ ہی ہیں جن میں شاعر نے خود کو زندہ رہنے اور سانس لینے کی میکانکی محنت سے دوچار کیا، غزل میں یہی احساسات اگر دل کے بوجھ کو کم کرتے ہیں تو نعت گوئی میں یہی مرہم ومداوا بن جاتے ہیں، رہبر صاحب غزل گو ہیں لیکن رسول اکرمؐ کے ذکر کی کرنیں نعت کے علاوہ غزلوں کو بھی نورانی بنا جاتی ہیں، اس مجموعہ غزلیات میں بھی نعتوں کا یہی رنگ ہے

اے طبیب روح پر غم الصلوۃ والسلام اے مرے زخموں کے مرہم الصلوۃ والسلام

لیکن غزل میں بھی کیسے دل کی بات، نعت ہوگئی

چھوڑ کر سارا جہاں سارا زمانہ آپ کے قدموں پہ آنا چاہتا ہوں
جس کے پیکر کا سایہ نہیں کوئی اس جیسا آیا نہیں

غزلوں میں آہنگ قدامت ہے لیکن حالات کی ترجمانی میں رنگ جدیدیت کی شوخی بھی کم خوش گوار نہیں، یہ مجموعہ بھی قارئین کے حسن ذوق وانتخاب کی دلیل بن سکتا ہے۔ ع۔ص

رسید کتب موصولہ

الماس (ماہنامہ) ''مولانا حبیب الرحمان اعظمی، حیات و خدمات (خاص نمبر): مرتبین مفتی شرف الدین عظیم اعظمی و مولانا حفظ الرحمان الاعظمی، مکتبہ ضیاء الکتب خیر آباد مئو۔

قیمت: ۵۰۰ روپے

تیری نظر میں (ہندی): جناب میکش اعظمی، الہدیٰ پبلی کیشن قاضی واڑہ دریا گنج نئی دہلی۔

قیمت: ۲۰۰ روپے

ذکر اقبال: جناب محمد ناصر سعید اکرمی، معہد الامام حسن البنّا بھٹکل کرناٹک۔ قیمت: ۵۰۰ روپے

عہد نبویؐ کی شاعری: ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی، مولانا ابوالحسن ندوی، اسلامک اکیڈمی پوسٹ باکس نمبر ۳۰، بھٹکل کرناٹک۔ قیمت: ۳۰۰ روپے

قافلہ خوشبو کا: جناب سردار سلیم، ہدیٰ بک ڈپو پرانی حویلی حیدرآباد، تلنگانہ۔ قیمت: ۳۰۰ روپے

قصص النبیین (عربی): العلامہ ابوالحسن علی حسنی ندوی اکادیمیۃ اِقرأ للبحث والنشر بنگلور۔

قیمت درج نہیں

مائی سیکسٹی تھری ریفلیکشنس (انگریزی): ڈاکٹر عبدالعلیم خاں، گڈول انیشی ایٹیو نشانت مسجد روڈ کوٹارائے پور چھتیس گڑھ۔ قیمت: ۳۰۰ روپے

متاع ذکر و فکر: مولانا شفیق الرحمان ندوی، مرتب جناب طارق شفیق ندوی، مشہود انٹر پرائزز، ندوہ روڈ لکھنؤ۔ قیمت: ۳۰۰ روپے

معارف کی کہانی مدیران معارف کی زبانی: مولانا کلیم صفات اصلاحی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

والد کے خطوط بیٹے کے نام: مرتب حاجی سید محمد مفیض الدین قادری، بشریہ اکیڈمی محلہ قاضی واڑہ، رام باغ روڈ بجنور یوپی۔ قیمت: ۳۵۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	2200/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی) مرتبہ: سید سلیمان ندوی	170/-
مقالات شبلی دوم (ادبی) ؍؍	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) ؍؍	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) ؍؍	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) ؍؍	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) ؍؍	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) ؍؍	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) ؍؍	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	150/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول ؍؍	150/-
مکاتیب شبلی دوم ؍؍	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Maarif (Urdu) -Print
OCTOBER 2021 Vo- 208 (4)
RNI.13667/57 MAARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibi Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات